استحکام پاکستان (۴)

تنظیم اسلامی کا پیغام

[illegible]

وقد اخذ میثاقکم ان کنتم مؤمنین

ماہنامہ میثاق لاہور

مدیر مسئول

ڈاکٹر اسرار احمد

مرکزی مکتبہ تنظیم اسلامی

۳۶-کے ماڈل ٹاؤن ○ لاہور

پنجاب بیوریجز کمپنی لمیٹڈ۔ فیصل آباد۔ فون: ۲۶۰۳۶ / ۲۳۹۳۱

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيثَاقَهُ الَّذِي وَاثَقَكُمْ بِهِ إِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا (القرآن)

اور اپنے اوپر اللہ کے فضل کو اور اس کے اس میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی

ماہنامہ میثاق لاہور

رجسٹرڈ

جلد ۳۵

شمارہ ۳

مارچ ۱۹۸۶ء

بمطابق

رجب المرجب ۱۴۰۶ھ

زرِ سالانہ ۳۰ روپے

فی شمارہ ۳/- روپے

مدیر مسئول

ڈاکٹر اسرار احمد

ادارۂ تحریر

شیخ جمیل الرحمٰن

مولانا محمد سعید الرحمٰن علوی

حافظ عاکف سعید

چودھری رشید احمد

مکتبہ تنظیم اسلامی ۳۶ کے . ماڈل ٹاؤن لاہور ۱۴ فون ۸۵۲۶۸۳

سب آفس: ۱۱- داؤد منزل، نزد آرام باغ، شاہراہ لیاقت کراچی: فون ۲۱۶۵۸۶

مشمولات

❖ تنظیمِ اسلامی کی خصوصی تربیت گاہ اور گیارہواں سالانہ اجتماع ——— ۳

❖ تذکرہ وتبصرہ ——— ۵

"تنظیمِ اسلامی کے رفقاء کی خدمت میں!"

——— ڈاکٹر اسرار احمد

❖ تنظیمِ اسلامی کا تعارف، اور اسلام کا انقلابی منشور ——— ۱۳

——— مرتّب کردہ: ڈاکٹر اسرار احمد

❖ اِستحکامِ پاکستان (۳) ——— ۲۱

—— کون سا اسلام؟

—— موجودہ مسلمان معاشرہ کا اسلام کے ساتھ عملی تعلّق

——— ڈاکٹر اسرار احمد

❖ مسلّح تصادم: غزوۂ بدر سے صلح حدیبیہ تک (۲) —— ۴۹

بسلسلۂ اسلامی انقلاب: مراحل، مدارج اور لوازم

——— ڈاکٹر اسرار احمد

❖ الہُدیٰ (۳۰ ویں نشست) ——— ۶۵

"حبلِ متین"، سورۂ حٰمٓ السجدہ کی آیات کی روشنی میں

——— ڈاکٹر اسرار احمد

❖ مولانا اشرف علی تھانویؒ پر تنقید کا جائزہ —— ۷۵

——— مولانا سیّد شمس الحسن تھانوی

❖ رفتارِ کار ——— ۸۹

کراچی میں امیرِ تنظیم کی مصروفیات اور سہ روزہ قرآنی تربیت گاہ

——— مرتّب: ضمیر اختر

ان شآء اللہ العزیز ــــ وبفضلہٖ تعالیٰ وعونہٖ

تنظیم اسلامی پاکستان

کے زیر اہتمام

خصوصی تربیت گاہ اور گیارہواں سالانہ اجتماع

جمعہ ۲۱ مارچ تا اتوار ۶ اپریل ۸۶ء

قرآن اکیڈمی، ماڈل ٹاؤن، لاہور

میں منعقد ہوں گے ــــ اور اسی موقع پر

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

کے سالانہ محاضراتِ قرآنی اور سالانہ اجلاسِ عام بھی منعقد ہوں گے

تفصیلات پشت پر ملاحظہ فرمائیں

شرکت کی عام دعوت ہے!

تفصیلی پروگرام

❖ جمعہ ۲۱ر مارچ کو ڈاکٹر اسرار احمد حسبِ معمول ساڑھے گیارہ بجے دن مسجد دارالسلام باغ جناح میں خطبہ دیں گے اور شام کو بعد نمازِ مغرب قرآن اکیڈمی میں خطاب عام فرمائیں گے۔

❖ ہفتہ ۲۲ر مارچ تا جمعرات ۳۱ر اپریل صبح کے اوقات میں (ماسوائے یوم جمعہ) قرآن اکیڈمی میں تنظیم اسلامی کی خصوصی تربیت گاہ کا پروگرام جاری رہے گا جس میں روزانہ:

- بعد نمازِ فجر ڈاکٹر صاحب کا درسِ قرآن ہوگا ——— اور
- ۹ بجے صبح تا ایک بجے دوپہر مطالعہ مذاکرہ جاری رہے گا!

❖ ان ہی ایام میں روزانہ بعد نمازِ مغرب اجتماعاتِ عام منعقد ہوں گے جو چار دن (بشرطِ دستیابی) جناح (ٹاؤن) ہال لاہور میں منعقد ہوں گے اور بقیہ ایام میں قرآن اکیڈمی ہی میں ہوں گے۔ ان میں:

- چھ دن 'استحکامِ پاکستان' کے موضوع پر مذاکرہ ہوگا جس میں ڈاکٹر اسرار احمد کے اس موضوع پر روزنامہ جنگ اور ماہنامہ میثاق میں شائع شدہ مضامین کو 'تنقید' کے لیے پیش کیا جائے گا!
- ایک شام "خیر آبادی مکتبِ فکر" کے لیے وقف رہے گی جس میں مولانا فضل حق خیر آبادی رح اور ان کے اولاد و احفاد اور تلامذہ کی علمی خدمات اور خصوصی فلسفیانہ نظریات پر مقالات پڑھے جائیں گے۔ اور
- دو شامیں ان بزرگ علماء کی صحبت سے فیض یاب ہونے کے لیے وقف ہیں گی جو مختلف علوم دینیہ میں ید طولیٰ رکھتے ہیں اور اُمت کے حق میں ان کا دم غنیمت ہے۔ مثلاً

❖ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ (بشرطِ صحت و تشریف آوری)
❖ مولانا عبدالقدوس ہاشمی صاحب، رکن عالمی فقہ کونسل، مکہ مکرمہ۔
❖ مولانا محمد طاسین صاحب، ناظم مجلس علمی کراچی

- چار شب میں انجمن خدام القرآن کے سالانہ محاضراتِ قرآنی کے لیے خاص رہیں گی۔ (یہ محاضرات ان شاء اللہ جناح ہال میں ہوں گے)

❖ جمعہ ۱۴ر اپریل تا اتوار ۱۶ر اپریل تنظیم اسلامی پاکستان کا سالانہ اجتماع منعقد ہوگا۔
❖ اتوار ۱۶ر اپریل کو بعد نمازِ عصر قرآن اکیڈمی میں انجمن کا سالانہ اجلاس عام ہوگا۔

——— انشاء اللہ العزیز ———

تذکرہ و تبصرہ

اسرار احمد

تنظیمِ اسلامی کے رفقاء کی خدمت میں!

اَحمدہٗ و اُصلّی علیٰ رسُولہِ الکریم اما بعد فاعوذ باللہ من الشّیطٰن الرّجیم

بسمِ اللہِ الرّحمٰنِ الرّحیمِ

محترم رُفقاءِ تنظیمِ اسلامی!

وَفّقنا اللّٰہُ وَاِیّاکُم لِمَا یُحِبُّ وَیَرضٰی [1]

السّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ!

سب سے پہلے تو میں اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں جس نے ہمیں خلعتِ وجود سے نوازا اور شرفِ انسانیت سے سرفراز فرمایا پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ اُمّتِ محمد علیٰ صاحبہا الصّلوٰۃ والسّلام میں پیدا فرمایا اور اس طرح ہمارے لئے نورِ ہدایت اور راہِ سعادت تک بسہولت رسائی کی صورت پیدا فرمادی

پھر میں مزید شکریہ ادا کرتا ہوں اس کے ان عظیم احسانات کا جو خاص طور پر اس عبدِ ضعیف پر اوائلِ عمر ہی سے ہوئے جن کے ذریعے اولاً میرے اندر ملّتِ اسلامی کا درد پیدا ہوا' پھر خصوصاً قرآنِ حکیم سے محبت و مناسبت پیدا ہوئی اور جوانی کے آغاز ہی سے یہ عزمِ مصمم بھی پیدا ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ توانائیوں اور صلاحیتوں کے بہتر و بیشتر کا ہدف اسیؐ کے پیغام کی نشر و اشاعت اور اسیؐ کے دین کے غلبہ و اقامت کی جد و جہد ہو گا۔

پھر یہ بھی سراسر اسیؐ کا فضل و کرم ہے کہ اس نے اس فیصلے پر استقامت عطا فرمائے رکھی اور نہ صرف یہ کہ حیاتِ دنیوی کے نشیب و فراز میں گم ہونے سے بچائے رکھا بلکہ خود اقامتِ دین کی راہ

---

[1] اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ سب کو ان کاموں کی (بیش از بیش) توفیق عطا فرمائے جو اسے پسند ہیں اور جن سے وہ راضی ہوتا ہے۔

سے کے متعدد اہم موڑوں پر دستگیری فرمائی اور رہ یابوسی اور دل شکستگی کے بعد ایک عزم تازہ سے سرفراز فرمایا اور اپنے خصوصی فضل و کرم سے ؎ "رکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور!" کی کیفیت تاحال برقرار رکھی : فللہ الحمد والمنۃ

اس کے بعد بموجب فرمانِ نبویؐ "مَنْ لَّمْ يَشْكُرِ النَّاسَ لَا يَشْكُرُ اللهَ" میں شکریہ ادا کرتا ہوں۔ آپ سب کا کہ آپ نے دین کی راہ میں میرے رفیق و ہمسفر اور اقامتِ دین کی جدوجہد میں میرے دست و بازو اور اعوان و انصار بننا قبول کیا جس کے نتیجے میں میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ :

؎ گئے دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں　　یہاں اب مرے رازداں اور بھی ہیں

اور ؎ میں اکیلا ہی چلا تھا جانبِ منزل مگر　　راہرو ملتے گئے اور قافلہ بنتا گیا

فَجَزَاكُمُ اللهُ عَنِّيْ اَحْسَنَ الْجَزَاءِ

گذشتہ سالانہ اجتماع پر تنظیم اسلامی نے اپنی زندگی کے دس سال پورے کر لئے تھے اور یہ بھی یقیناً اللہ تعالیٰ کی خصوصی عنایت و رحمت کا مظہر ہے کہ ہم نے اس موقع پر محاضراتِ قرآنی کا عنوان "تصورِ فرائض دینی" کو بنایا اور اس موضوع پر میں نے اپنے مطالعہ و فکر کا لبّ لباب تحریری صورت میں پیش کیا اور اس پر ملک کے نامور علماءِ کرام کو بلاتفریقِ مسلک و مشرب اظہارِ رائے کی دعوت دی۔

اُن چھ روزہ محاضرات میں شرکت کرنے والے ہر شخص کو معلوم ہے کہ خود میں ان محاضرات کے دوران محض 'سامع' رہا اور اللہ گواہ ہے کہ یہ سماعت نہ معاندانہ تھی نہ لاابالیانہ بلکہ "اَوْ اَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيْدٌ" کی امکانی حد تک تعمیل کے ساتھ تھی! پھر یہ بھی ہم سب پر اللہ تعالیٰ کے خصوصی فضل و کرم کا مظہر تھا کہ اس کے باوجود کہ بعض حضرات نے نہ صرف یہ کہ ہمارے موقف پر شدید تنقید کی بلکہ استہزائیہ انداز تک اختیار کیا لیکن ہم نے اپنے مہمانوں کا اعزاز و اکرام برقرار رکھا اور سب کچھ صبر سے سنا چنانچہ الحمدللہ کہ دورانِ محاضرات کسی تلخی کا شائبہ تک پیدا نہ ہوا۔

ان محاضرات میں ہمیں بعض بزرگ اور معروف علماءِ کرام کی جانب سے مکمل تائید و توثیق ملی۔ بعض حضرات نے بعض اجزاء سے اختلاف کا اظہار فرمایا۔ بعض نے محض کچھ احتیاطوں کی نصیحت فرمائی اور بعض حضرات نے میری روا روی میں سپردِ قلم ہونے والی تحریر کی بعض لفظی فروگذاشتوں

کو تنقید کا موضوع بنایا لیکن جب میں نے انہیں بتایا کہ ان امور کی وضاحت میں محاضرات سے قبل والے جمعہ میں مسجد دار السلام میں کر چکا تھا تو الحمد للہ کہ انہوں نے اطمینان کا اظہار فرمایا۔ اس کی نمایاں ترین مثال مولانا الطاف الرحمٰن بنوی ہیں جنہوں نے محاضرات میں جو مقالہ پڑھا تھا وہ خاصہ "تیکھا" تھا۔ لیکن بعد میں ان کی جو تحریر موصول ہوئی وہ ہمارے موقف کی مکمل تائید کی حامل ہے (یہ تحریر گذشتہ ماہ کے "حکمت قرآن" میں شائع ہو چکی ہے)

بہر حال میں اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتا ہوں کہ ان محاضرات کے نتیجے میں مجھے اپنے بنیادی تصورِ دین اور تصورِ فرائضِ دینی پر مزید اطمینانِ قلب اور انشراحِ صدر نصیب ہوا۔ چنانچہ میں نے اس سال کے دوران پہلے سے بھی زیادہ اعتماد کے ساتھ اللہ کے ماننے والوں کو اس کے دین کے ان تقاضوں کو ادا کرنے کی مقدور بھر دعوت دی۔

ہمارے لئے حرکت و عمل کا اصل جذبۂ محرکہ تو یہی ہے کہ ہم اپنے دینی فرائض کی ادائیگی کے ضمن میں خود امکان بھر بندگیٔ رب کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے اللہ کے دین کی دعوت و شہادت کے ساتھ ساتھ اس کے غلبہ و اقامت کے لئے مقدور بھر سعی کرتے رہیں اور اس ضمن میں امکانی حد تک تحقیق و تفتیش سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اُسوہ و طریق کا فہم و شعور حاصل کریں اور حتی المقدور اسی کی پیروی کی کوشش کریں! ــــــ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ حقیقت بھی پیشِ نظر رہنی چاہیئے کہ ہمارے دین میں حقوق اللہ کے ساتھ ساتھ حقوق العباد تو ہیں ہی، ان تمام بیجان اشیاء کے حقوق بھی ہیں جن سے ہم انتفاع کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ جس راستے پر انسان چلتا ہے۔ اس کا بھی اس پر حق قائم ہو جاتا ہے ــــــ!

یہ بات بادنیٰ تامل سمجھ میں آجاتی ہے کہ ہمارے لئے ایسی تمام اشیاء میں سرِ فہرست بلکہ صحیح تر الفاظ میں ان سب کا جامع مظہر وطنِ عزیز پاکستان ہے، جس میں ہم آباد ہیں جس کی زمین سے ہمیں غذا حاصل ہو رہی ہے اور جس کی فضا میں ہم سانس لے رہے ہیں لہٰذا اس کے بقاء و استحکام کی جدوجہد بھی ہمارا فرض ہے اور اس کی عزت و آبرو اور آزادی و خود اختیاری کی حفاظت میں جان کی بازی لگا دینا ہماری ذمہ داری ہے!

ہم پر اللہ کا احسان یہ ہے کہ ہمارے لئے دین اور وطن کے تقاضے مختلف یا متضاد نہیں ہیں بلکہ کمالِ وحدت کا مظہر ہیں۔ اس لئے کہ ہمارا وطن وہ ہے جو قائم ہی اسلام کی اساس پر ہوا

ہے اور اس کے بقا و استحکام کا کل دار و مدار اقامتِ دین یا غلبۂ اسلام پر ہے۔

جہاں تک ہمارے دینی فرائض کا تعلق ہے انہیں میں نے اپنی امکانی حد تک تحریروں اور تقریروں اور بالخصوص مطالعۂ قرآن حکیم کے منتخب نصاب کے دروس کے ذریعے بفضلِ اللہ تعالیٰ وبعونہٖ اب سے بہت پہلے اس حد تک واضح کر دیا تھا کہ کسی نیک نیت انسان کو ان کے بارے میں کوئی اشتباہ باقی نہیں رہ سکتا۔ البتہ جہاں تک ملک و وطن کے مسائل کا تعلق ہے تو اگرچہ گاہے گاہے یہ امور بھی میری تحریر و تقریر کا موضوع بنے تاہم ان پر سیر حاصل گفتگو ابھی باقی تھی۔ اور میں اسے اللہ تعالیٰ کی مشیّتِ خصوصی کا مظہر سمجھتا ہوں کہ اس موضوع پر ایک باضابطہ تالیف کی صورت پیدا ہو گئی جس کے نصف اوّل کا حاصل صرف یہ ایک جملہ ہے کہ:

'پاکستان کے استحکام کا واحد ذریعہ اسلامی انقلاب ہے!!!'

کتاب کا یہ حصّہ روزنامہ 'جنگ' میں ان شاء اللہ جمعہ ۲۸ فروری تک اور 'میثاق' میں اپریل کے شمارے تک شائع ہو جائے گا! ـــــ کتاب کا نصف ثانی اسلامی انقلاب کے طریق و منہاج کی تفصیل پر مشتمل ہوگا جس کا واحد ماخذ سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ یہ مضمون 'میثاق' میں شائع شدہ تقاریر کے ذریعے بہت حد تک سامنے آچکا ہے۔ میرا ارادہ ہے کہ اسے از سرِ نو اپنے قلم سے مرتّب کر دوں تاکہ یہ بھی روزنامہ 'جنگ' کے ذریعے وسیع پیمانے پر لوگوں کے سامنے آجائے۔

بہرحال اس کے بغیر بھی کم از کم آپ حضرات (رفقاءِ تنظیمِ اسلامی) کی حد تک بات پورے طور پر سامنے آچکی ہے! اور کم از کم آپ لوگوں پر میری جانب سے اس ضمن میں بھی حجّت قائم ہو چکی ہے!

اب سوال عمل کا ہے ـــــ بقول اقبال:

"یہ گھڑی محشر کی ہے، تو عرصۂ محشر میں ہے
پیش کر غافل عمل کوئی اگر دفتر میں ہے"ـــ

اور اس کے ضمن میں اللہ تعالیٰ کا اٹل قانون یہ ہے کہ کسی انسان پر حقیقت کا انکشاف جس قدر زیادہ ہو جائے اسی قدر زیادہ وہ مسئول اور ذمّہ دار ہو جاتا ہے۔

اس سلسلے میں اگرچہ مجھے اقبال کی یہ نصیحت بھی خوب اچھی طرح یاد ہے کہ:

"نومید نہ ہو ان سے اے رہبرِ فرزانہ !
کم کوش تو ہیں لیکن بے ذوق نہیں راہی!"

لیکن اس کے باوصف اب ؎ " زین ہمرہانِ سست عناصر دلم گرفت " کی کیفیت اتنی شدید ہوگئی ہے کہ ؎ " نوارا تلخ ترمی زن چو ذوقِ نغمہ کم یابی " کے مصداق اپنے آپ کو کسی قدر " تلخ نوائی " پر مجبور پاتا ہوں ۔ امید ہے کہ آپ اسے "گوارا" فرمائیں گے !

ہم نے تنظیم اسلامی کی اساس ہجرت و جہاد فی سبیل اللہ اور سمع وطاعت فی المعروف کی ماثور و مسنون بیعت پر قائم کی ہے ۔ جس کی بے شمار برکات میں سے بعض کا ذکر میں نے ستمبر ۸۵ء کے شمارے میں کیا تھا ۔ (جس کا اقتباس فروری ۱۹۸۶ء میں دوبارہ سامنے آچکا ہے) ۔ اس طریق تنظیم کا لازمی اور منطقی نتیجہ یہ ہے کہ جس وقت کوئی شخص کہے کہ اس نے اس بیعت کے تقاضوں کو اچھی طرح سمجھ لیا ہے ۔ اور وہ پورے فہم و شعور کے ساتھ بیعت کرنا چاہتا ہے میں اس کی بیعت قبول کر لیتا ہوں ۔ لیکن تجربے سے اندازہ ہوا کہ بہت سے حضرات اس بیعت کی ذمہ داریوں کا پورا احساس و ادراک نہیں رکھتے اور اسے صرف ایک ذہنی سہارا بنا لیتے ہیں جیسے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک قول مبارک کے مطابق بعض لوگ قرآن مجید کو بس ایک 'تکیہ' بنا لیتے ہیں ("یَا اَھْلَ الْقُرْاٰنِ لَا تَتَوَسَّدُوا الْقُرْاٰنَ" بیہقی عن عبیدۃ ملیکیؓ) ایسے تمام حضرات کو سنجیدگی سے سوچنا چاہئے کہ اس صورت میں اندیشہ ہے کہ کہیں لینے کے دینے نہ پڑ جائیں ۔ اس لئے کہ اسلام میں تو عام وعدہ و عہد کی بھی بہت اہمیت ہے ، بفحوائے الفاظ قرآنی " اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا " (بنی اسرائیل : ۳۴) اور " يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ " (مائدہ : ۱) ـــــ تو ہجرت و جہاد اور سمع وطاعت کی بیعت تو بہت بڑا عہد ہے اور اس کی ذمہ داری بہت بھاری ہے ۔ چنانچہ اس عہد کی خلاف ورزی کا ذکر سورۂ فتح کی آیت ۱۰ میں بڑی شدید وعید کے انداز میں آیا ہے ۔ یعنی " فَمَنْ نَّكَثَ فَاِنَّمَا يَنْكُثُ عَلٰى نَفْسِهٖ " ، یعنی جو کوئی اس کی خلاف ورزی کرے گا وہ اس کا سارا وبال اپنے ہی اوپر لے گا ۔ بنابریں ایسے تمام حضرات سے جنہوں نے کسی وقتی اور جذباتی تحریک سے بیعت کر لی تھی لیکن بعد میں یا پورے طور سے مطمئن نہ رہے یا اپنی ہمت و عزیمت کو مجتمع نہ کر پائے میری درخواست یہ ہے کہ از خود اپنی بیعت کو فسخ کر کے مجھے مطلع فرما دیں ۔ اس لئے کہ اگرچہ اس بیعت کا معاملہ یک طرفہ ہے اور ساری ذمہ داری

بیعت کرنے والا قبول کرتا ہے تاہم مجھے ایسے حضرات کے طرزِ عمل سے جو کوفت ہوتی ہے اس طرح کم از کم اس سے نجات حاصل ہو جائے گی! ——— اور اگر معاملہ محض تساہل کا ہے تو چاہیئے کہ از سرِ نو عزمِ مصمم کے ساتھ کمرِ ہمت کسی جائے اور پوری طرح آمادۂ عمل اور پابند نظم بن جایا جائے۔

اسی طرح بعض حضرات کے بارے میں یہ گمان ہوتا ہے کہ انہوں نے تنظیم اسلامی کو بھی عام معنی میں کوئی تبلیغی ادارہ یا اصلاحی انجمن سمجھ لیا ہے اور فریضہ اقامت دین کے انقلابی تقاضے تا حال ان پر واضح نہیں ہیں۔ ایسے حضرات سے بھی یہ درخواست بے محل نہ ہوگی کہ وہ تنظیم کی دعوت اور اس کے اصول و مبادی اور کل صغریٰ کبریٰ پر اچھی طرح نظرِ ثانی فرمائیں اور اگر ان کا مزاج اس کے انقلابی منہاج سے ہم آہنگی نہ رکھتا ہو بلکہ وہ صرف کسی علمی و تعلیمی، یا اصلاحی و تبلیغی کام ہی کی جانب رجحان رکھتے ہوں تو اپنے وقت اور صلاحیت کا مصرف کسی اور ادارے یا انجمن کو بنائیں۔

اس ضمن میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ محسوس ہوتا ہے کہ تنظیم کے اکثر رفقاء نے تا حال اقامتِ دین کی جدّ و جہد کو اپنی زندگی میں 'اوّلیت' نہیں دی بلکہ صرف ثانوی اور اضافی حیثیت دی ہوئی ہے۔ کہ اگر دنیا کے دوسرے کاموں سے فرصت مل جائے تو کچھ کام ادھر کا بھی ہو جائے ورنہ 'عُذرِ مصروفیت' ان کے اطمینان کے لئے کفایت کرتا ہے! جبکہ واقعہ یہ ہے کہ اس راہ میں کوئی پیشقدمی ممکن ہی نہیں ہے جب تک ایک کثیر تعداد میں ایسے لوگ مہیّا نہ ہو جائیں جو تقریباً 'ہمہ تن' اور 'ہمہ وقت' اس کام میں لگ جائیں اور حیاتِ دنیوی اور اس کے جملہ متعلقات کے ساتھ ان کا تعلق صرف ثانوی اور ضمنی بن کے رہ جائے۔

مجھے شدّت کے ساتھ احساس ہے کہ ہماری دعوت اور تنظیم اب اس مرحلے پر آگئی ہے کہ اسے ایک معتدبہ تعداد میں ایسے 'ہمہ تن' اور 'ہمہ وقت' لوگ فوری طور پر میسّر نہ آئے تو اب تک کا کیا کرایا بھی ضائع جائے گا۔ اور قدم آگے بڑھنے کی بجائے پیچھے کی جانب ہٹنے لگیں گے۔ چنانچہ تحریرِ ہٰذا کے ذریعے میں ایسے ہی ساتھیوں کو ندا دے رہا ہوں کہ:

مَنْ اَنْصَارِیْ اِلَی اللّٰہِ!

اس کا یہ مطلب ہرگز نہ لیا جائے کہ یہ کوئی بامعاوضہ "ہمہ وقتی کارکنوں" کے لئے "ضرورت ہے" کی قسم کا اشتہار ہے۔ اس لئے کہ اگرچہ یہ واقعہ ہے کہ کوئی بھی عوامی تحریک ہمہ وقتی کارکنوں کے بغیر نہیں چل سکتی اور ان میں سے جن کے پاس کوئی مستقل ذرائع آمدن نہ ہوں ان کے لئے کوئی

'معاوضہ' یا 'اعزازیہ' قبول کرنا ایک ناگزیر برائی ہے ـــــ تاہم صحیح بات یہی ہے کہ بامعاوضہ خدمات کا معاملہ تعلیم و تدریس اور دفتری و انتظامی قسم کی ذمہ داریوں کے ضمن میں تو درست ہے لیکن کسی دینی تحریک کے اصل 'مردانِ کار' اور تنظیم کی مختلف سطحوں (LEVELS) پر قیادت اور سربراہی کے فرائض سرانجام دینے والوں کے لئے ہرگز مناسب نہیں! اس سطح پر تو اصل مناسبت صرف ذاتی عزیمت اور اللہ پر توکل کو ہے۔ اور فی الوقت میری 'ندا' ایسے ہی اصحابِ ہمت کے لئے ہے جو مختلف مقامات پر تحریک کی ذمہ داریوں کا اصل بوجھ اٹھا سکیں۔

اس ضمن میں میں پورے وثوق اور اعتماد کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ فی الواقع اگر کوئی انسان شعوری طور پر پورے خلوص کے ساتھ فیصلہ کرلے کہ وہ 'ہمہ تن' اور 'ہمہ وقت' دین کی خدمت میں لگ جائے گا تو اللہ تعالیٰ ابتداءً اس کے عزم اور خلوص کو آزماتا تو ضرور ہے اور اسے امتحان کی کچھ نہ کچھ بھٹیوں میں سے لازماً گذرنا پڑتا ہے تاہم اس آزمائش میں پورا اترنے کی توفیق بھی اللہ خود ہی دیتا ہے اور بالآخر اس کی کفالت کا انتظام کسی جماعت سے تنخواہ کی بنیاد پر نہیں بلکہ "مِنْ حَیْثُ لَا یَحْتَسِبُ"[1] قسم کے ذرائع سے فرما دیتا ہے۔ گویا اُسے خود اپنی جانب سے 'فارغ' کر دیتا ہے

؎ سفر ہے شرط، مسافر نواز بہتیرے ہزارہا شجرِ سایہ دار راہ میں ہے!

لہٰذا جو رفقاءِ تنظیم اس کا اپنے دل میں پختہ عہد کرلیں، قطع نظر اس سے کہ فی الوقت ان کے سامنے کوئی محسوس و معلوم مالی ذرائع ہیں یا نہیں اور بلا لحاظ اس کے کہ وہ عمر اور صحت کے اعتبار سے کس کیفیت میں ہیں۔ وہ میری پکار پر 'لَبَّیْکَ' کہنے میں جھجک محسوس نہ کریں اور ایسے تمام رفقاء سے میری پہلی گذارش یہ ہے کہ وہ ۲۱ مارچ تا ۶ اپریل ۸۶ء (کُل سترہ دن) ہر حال میں اور ہر قیمت (RISK) پر فارغ کرلیں اور جمعہ ۲۱ مارچ کو نمازِ جمعہ سے قبل لاہور (قرآن اکیڈمی یا مسجد دارالسلام) پہنچ جائیں۔ اسی کے لئے مناسب مدت مہلت (NOTICE) دینے کے لئے 'میثاق' کا یہ شمارہ راقم نے معمول سے پہلے تیار کرایا ہے تاکہ رفقاء کو سفر کی تیاری کے لئے مناسب وقت مل جائے! ایسے رفقاء سے ایک اضافی گذارش یہ ہے کہ میری اس پکار پر 'لَبَّیْکَ' کی اطلاع فوری طور پر ارسال کر دیں۔

۲۱ مارچ کی شام سے ۳ اپریل کی شام تک اس سال کی چوتھی تربیت گاہ کا پروگرام پہلے سے طے شدہ ہے، لیکن اب یہ تربیت گاہ سابقہ تین تربیت گاہوں کے نہج پر نہیں ہوگی بلکہ

---

[1] سورۂ طلاق: ۳ ترجمہ: "جہاں سے اُسے سان گمان بھی نہ ہو۔"

تنظیم کے متذکرہ بالا قسم کے 'ہمہ وقت کارکنوں' کے خصوصی اجتماع کی نوعیت کی ہوگی جس میں زیادہ تر وقت مشورہ، مذاکرہ اور تبادلہ خیالات میں صرف ہوگا تاکہ آئندہ کے لائحہ عمل کے بارے میں تنظیم کے اس سطح کے کارکنوں کے ذہنوں میں کوئی اشکال یا اشتباہ باقی نہ رہے اور ہماری تحریک پوری یکسوئی اور ہمواری کے ساتھ آگے بڑھ سکے! اس لئے کہ آئندہ ان شاء اللہ العزیز یہی رفقاء تنظیم کی اصل ریڑھ کی ہڈی کا کام دیں گے، اور اوّل تو ان میں سے اکثر کو مرکز ہی میں جمع کرنے کی کوشش کی جائے گی جہاں سے انہیں مختلف مقامات پر بھیجا جاسکے ورنہ وہ اپنے اپنے مقامات پر کام کرتے ہوئے ہر دم تیار رہیں گے کہ جہاں ضرورت ہو ان کو بھیج دیا جائے۔ اس طرح وہ جدید بینکنگ کی اصطلاح میں تنظیم کا "DEPOSIT AT CALL" ہوں گے!

ان حضرات سے ایک مزید گذارش یہ ہے کہ تنظیم کے بنیادی لٹریچر کو بھی از سرِ نو نگاہوں سے گذار کر تشریف لائیں اور میرے 'استحکام پاکستان' والے حالیہ مضامین کا بھی مطالعہ کر کے آئیں۔

تاہم اس کا یہ مطلب نہ لیا جائے کہ اگر کچھ نئے رفقاء نے اس تربیت گاہ میں شمولیت کا فیصلہ کیا ہوا تھا تو وہ تشریف نہ لائیں، ان شاء اللہ ایسا اہتمام کر لیا جائے گا کہ کچھ پروگرام مشترک نوعیت کے ہوں اور کچھ نئے رفقاء کی خصوصی ضرورت کو ملحوظ رکھتے ہوئے علیحدہ ترتیب دے لئے جائیں۔

اس کے بعد جمعہ ۱۴ تا اتوار ۱۶ اپریل ۸۶ء تنظیم کا معمول کے مطابق سالانہ اجتماع ہوگا۔ جس میں جملہ رفقاءِ تنظیم کی شرکت لازمی ہے اور جس شخص نے مجھ سے بیعت کی ہوئی ہے اسے یہ جان لینا چاہیئے کہ اگر اس کے علم میں میری یہ ہدایت آجائے اور کوئی شدید عذر بھی مانع نہ ہو تو اس کی اجتماع سے غیر حاضری بیعت کے منافی ہوگی۔

چونکہ تنظیم کے بہت سے رفقاء مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے رکن بھی ہیں لہٰذا وہ یہ بھی نوٹ فرمالیں کہ ۱۶ اپریل کی شام کو ان شاء اللہ انجمن کا سالانہ اجلاس بھی قرآن اکیڈمی ہی میں منعقد ہونا طے پایا ہے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنی اپنی ذمہ داریوں کو پورے احساس مسئولیت کے ساتھ ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ فقط والسلام!

خاکسار

اسرار احمد عفی عنہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تنظیمِ اسلامی

نہ معروف معنی میں سیاسی جماعت ہے نہ مذہبی فرقہ

بلکہ ایک **انقلابی اسلامی پارٹی** ہے جو

پہلے پاکستان اور بالآخر پورے کرّۂ ارضی پر

دینِ حق

یعنی اسلام کے کامل نظامِ عدل و قسط کو

غالب و قائم کرنا چاہتی ہے

جس کے نتیجے میں ——— اِن شاء اللہ العزیز

سماجی سطح پر

(۱) کامل انسانی مساوات اور گہری اسلامی اخوّت قائم ہوگی اور نسل، رنگ، زبان، پیشے اور جنس کی بنیاد پر نہ کوئی اونچا رہے گا نہ نیچا ـــــ بلکہ عزت و شرافت کا معیار صرف تقویٰ اور خدا ترسی ہونگے:

کلُّ مومن اخوۃٌ ـ اندر دلش حُرّیت سرمایۂ آب و گلشؔ

ناشکیبِ امتیازات آمدہ!! در نہادِ او مساوات آمدہؔ

(۲) پردہ یعنی ستر اور حجاب کے شرعی احکام کے نفاذ سے خواتین کی نسوانیت اور عزت و وقار کو کامل تحفظ حاصل ہوگا اور اسلام کے ؔ "حافظِ ناموسِ زن، مرد آزما، مرد آفریںؔ" خاندانی نظام کے تحت خواتین کو معاشی کفالت کی پوری ضمانت حاصل ہوگی تاکہ وہ پوری یکسوئی کے ساتھ آئندہ نسل کی تربیت کے فرائض بہترین طریقے پر سرانجام دے سکیں:

بتولے باش و پنہاں شو ازیں عصر کہ در آغوشِ شبیرؓے بگیری!ؔ

البتہ ان کے حقوقِ ملکیت و وراثت کو مکمل تحفظ حاصل ہوگا۔

اور تعلیم، صحت اور گھریلو صنعتوں کے میدان میں ان کی توانائیاں اور صلاحیتیں قومی سطح پر بھرپور انداز میں بروئے کار آئیں گی۔

(۳) اسلامی حدود اور تعزیرات کے نفاذ سے بدامنی کا مکمل خاتمہ ہو جائے گا اور قتل، چوری اور ڈاکے کے علاوہ زنا اور تہمتِ زنا کی بھی بیخ کنی ہو جائے گی!

(۴) سماجی برائیوں جیسے رشوت، بے جا اسراف، نمود و نمائش پر دولت کا ضیاع اور شادی بیاہ کی ہندوانہ رسومات کا استیصال ہو جائے گا!

(۵) مفت اور جلد از جلد انصاف مہیا ہوگا اور جھوٹی گواہی کا خاتمہ ہو جائے گا!

(۶) تعلیم کے ضمن میں جدید اور قدیم، دینی اور دنیوی اور امراء و غرباء کی تقسیم ختم ہو جائے گی۔ سب کے لئے ایک ہی نظامِ تعلیم ہوگا جو کم از کم میٹرک تک مفت ہوگا!

---

۱ مسلمان کے دل میں یہ بات نقش ہوتی ہے کہ سب مسلمان آپس میں بھائی ہیں اور آزادی کا جذبہ اس کی سرشت میں داخل ہے!

۲ بندۂ مومن (رنگ، نسل، زبان وغیرہ) کے امتیازات سے ناآشنا ہوتا ہے اور مساواتِ انسانی کا تصور اس کے وجود کا جزو لاینفک ہے

۳ "عورت کے ناموس کی حفاظت کرنے والا اور مرد کو ذمہ داری اور مردانگی کے اوصاف عطا کرنے والا"

۴ (اے مسلمان خاتون) حضرتِ فاطمہؓ کے نقشِ قدم پر اور چل تہذیبِ حاضر سے کنارہ کشی کرتا کہ تیری گود میں حضرتِ حسینؓ جیسے فرزند ہوں!

معاشی سطح پر

(۱) ریاست ہر شہری کی ناگزیر بنیادی ضروریات (غذا، لباس، رہائش، تعلیم اور علاج) کی کفالت کی ذمہ دار ہوگی اور اس کے لئے مسلمانوں سے زکوٰۃ اور غیر مسلموں سے جزیے کی وصولی کا نظام پورے طور پر نافذ ہوگا!

کس نہ باشد در جہاں محتاجِ کس   نکتۂ شرعِ مبین این است و بس!![1]

(۲) مزید برآں صدقاتِ نافلہ، انفاق فی سبیل اللہ اور قرضِ حسنہ کا جذبہ پروان چڑھے گا۔

جو حرف "قل العفو" میں پوشیدہ تھا اب تک!   اِس دَور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار

(۳) سود کی لعنت کا مکمل خاتمہ ہو جائے گا اور، جوئے، سٹے، لاٹری، دو طرفہ آڑھت اور خرید و فروخت کی جملہ حرام صورتوں کے کلی انسداد سے "سرمایہ داری" کی جڑ کٹ جائے گی!

از ربا جاں تیرہ دل چوں خشت و سنگ!   آدمی دَرندہ بے دندان و چنگ!![2]

(۴) شریعتِ اسلامی کی حدود کے اندر اندر انفرادی ملکیت اور آزاد معاشی جدّوجہد کی فضا برقرار رہے گی اور اس ضمن میں صحتمند مقابلہ سے صنعت و تجارت کو فروغ اور پیداوار میں اضافہ ہوگا

(۵) اجیر و مستاجر یعنی مزدور اور کارخانہ دار کے درمیان اسلامی اخوت اور عدل و انصاف کے علاوہ "باہمی سوداکاری" میں مزدور کو ریاست کی جانب سے کفالت کی ضمانت کا سہارا حاصل ہوگا۔

(۶) جاگیرداری کی لعنت کا مکمل خاتمہ ہو جائے گا خواہ امام ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ کے اس متفقہ فتویٰ پر عمل کے ذریعے کہ مزارعت حرام ہے خواہ حضرت عمرؓ کے اجتہاد پر مبنی فقہ حنفی کے اس فتویٰ پر عمل کے ذریعے کہ جو علاقے کسی بھی وقت بزورِ شمشیر فتح ہوئے تھے ان کی اراضی انفرادی ملکیت نہیں ہوتیں بلکہ اسلامی ریاست کے بیت المال کی ملکیت ہوتی ہیں زمینداری کی جملہ خرابیاں ختم ہو جائیں گی!

خدا آں ملّتے را سروری داد   کہ تقدیرش بدستِ خویش بنوشت[3]
باآں قومے سروکارے نہ دارد   کہ دہقانش برائے دیگراں کشت[4]

---

[1] شریعتِ اسلامی کا اہم ترین نکتہ یہی ہے (ایسا اجتماعی نظام قائم ہو) کہ کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا (انفرادی سطح پر) محتاج نہ رہے!

[2] سود خوری سے انسان کا باطن تاریک اور دل پتھر کی طرح سخت ہو جاتا ہے اور انسان بغیر (درندوں والے) پنجوں اور دانتوں کے درندہ بن جاتا ہے

[3] اللہ اسی قوم کو دنیا میں سربلندی عطا فرماتا ہے جس کے افراد اپنے ہاتھوں سے اپنی تقدیر لکھتے ہیں (یعنی خود محنت کرکے کھاتے ہیں)

[4] اللہ اس قوم سے کوئی سروکار نہیں رکھتا جس کے کاشتکاروں کے خون پسینے کی کمائی کوئی اور (زمیندار و جاگیردار) ہڑپ کر جاتے ہیں!

سیاسی سطح پر

(۱) حاکمیت مطلقہ صرف اللہ کی ہوگی، چنانچہ کوئی قانون سازی اللہ کی کتاب اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سنّت کے منافی نہیں کی جاسکے اور اعلیٰ عدالتوں کو پورا اختیار ہوگا کہ کتاب وسنّت کے منافی ہر قانون کو بلا استثناء کالعدم قرار دے دیں۔

سروری زیبا فقط اس ذاتِ بے ہمتا کو ہے — حکمراں ہے اک وہی باقی بتانِ آذری!

(۲) ریاست کے کامل شہری صرف مسلمان ہوں گے اور اُن کے حقوق شہریت بالکل مساوی ہوں گے اور وہ اسلام کے اصولِ مشاورت کے مطابق باہمی مشورے سے ملک کے نظام کو چلائیں گے۔

(۳) قانون کی نگاہ میں سب برابر ہوں گے اور کوئی شخص حتیٰ کہ صدر ریاست بھی قانون سے بالاتر نہ ہوں گا۔

(۴) غیر مسلموں کی جان و مال اور عزّت و آبرو کی حفاظت کا پورا ذمہ لیا جائے گا اور انہیں کامل معاشی اور مذہبی آزادی حاصل ہوگی۔ چنانچہ وہ اپنی آئندہ نسلوں کی اپنے مذہب کے مطابق تعلیم و تربیت کے حق دار ہوں گے۔ البتہ انہیں مسلمانوں میں تبلیغ کا حق حاصل نہیں ہوگا۔

(۵) وحدانی یا فیڈرل یا کنفیڈرل نظام ریاست ——— اور اسی طرح صدارتی یا پارلیمانی طرزِ حکومت میں سے کسے اختیار کیا جائے اس کا فیصلہ عوام کی کھلی رضامندی پر منحصر ہوگا اس لئے کہ ان میں سے کوئی بھی نہ دینی اعتبار سے لازمی ہے نہ حرام یا ناجائز!

(۶) علاقائی یا نسلی و قبائلی روایات میں سے جو شریعتِ اسلامی سے متصادم نہ ہوں انہیں پورا تحفظ حاصل ہوگا۔ اسی طرح علاقائی زبانوں کے حقوق کی حفاظت ہوگی البتہ سب سے زیادہ زور عربی پر دیا جائے گا۔

الغرض! پاکستان دورِ جدید کی بہترین اسلامی، جمہوری اور فلاحی ریاست بن جائے گا!!

اللہ تعالیٰ ہمیں اس عظیم مقصد کیلئے تن من دھن لگا دینے کا عزمِ مصمم کرنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین!

نوٹ: ان صفحات میں اسلام کے معاشرتی، معاشی اور سیاسی نظام کے جو اہم خدّ و خال درج کئے گئے ہیں وہ سب کتاب وسنّت کی محکم اساسات پر مبنی ہیں لیکن آیات و احادیث کا حوالہ جگہ کی کمی کے باعث بھی نہیں دیا جاسکتا اور آیات و احادیث اس لئے بھی درج نہیں کی گئیں کہ اسے بڑے پیمانے پر پھیلانا ہے جس سے مقدّس عبارات کی بے حرمتی کا اندیشہ ہے! علامہ اقبال مرحوم کے اشعار بھی اس لئے نہیں درج کئے گئے کہ وہ بجائے خود دلیل ہیں بلکہ محض اس لئے کہ وہ کتاب وسنّت کی تعلیمات کی اختصار اور جامعیت کے ساتھ دل نشیں پیرائے میں ترجمانی کرتے ہیں!

اسلامی انقلاب

کے لئے تنظیمِ اسلامی کے پیشِ نظر

طریقِ کار

یہ ہے کہ ———————— جو لوگ،

اللہ کی رضا اور آخرت کی فلاح

کے حصول کے لئے سر دھڑ کی بازی لگانے کو تیار ہوں، وہ ————

(۱) سب سے پہلے خود پوری طرح مسلمان اور حقیقی معنی میں اللہ کے بندے بنیں اور اپنی ذات اور اپنے دائرۂ اختیار میں شریعتِ اسلامی کو نافذ کریں! اور اس کے لئے اپنے نفس کے خلاف بھی جہاد کریں اور بگڑے ہوئے ماحول سے بھی مردانہ وار کشمکش کریں:- اور مقدور بھر اسی کی دعوت دوسروں کو بھی دیں

نفسِ ما ہم کم تر از فرعون نیست ... لیکن اورا عون ایں را عون نیست[۱]

اور بقول ... زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ ستیز![۲]

(۲) باہم دینی اخوّت اور ایمانی محبت کے رشتوں میں بندھ کر آپس میں نہایت رحیم و شفیق اور دین کے باغیوں اور مخالفوں کے خلاف سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن جائیں۔

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم ... رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن!

---

۱ میرا نفس بھی (اللہ کے خلاف بغاوت اور سرکشی میں) فرعون سے کم تر نہیں لیکن اس کے پاس لاؤ لشکر تھا (لہٰذا اس نے زبان سے بھی خدائی کا دعوٰی کر دیا) جو میرے نفس کے پاس نہیں ہے! (لہٰذا میں زبان سے کچھ نہیں کہتا۔) (رومی)

۲ اگر زمانہ تمہارے ساتھ موافقت نہ کرے تو (بجائے اس کے کہ تم اس سے شکست مان لو) اس سے لڑو!

(۳) کسی ایسے شخص کے ہاتھ پر جس کے عزم و ارادہ، اصابتِ رائے اور خلوص و اخلاص پر دل و دماغ گواہی دیں ہجرت و جہاد اور سمع و طاعت فی المعروف کی بیعت کر کے ایک جماعتی نظم میں منسلک ہو جائیں۔

اور اس طرح جو اجتماعی قوت وجود میں آئے وہ :—

(ا) جب تک یہ قوت مناسب مقدار میں جمع نہ ہو جائے تن من دھن کے ساتھ : ——————

(۱) اسی دعوت و تربیت اور تنظیم کی توسیع و استحکام کی جدّ و جہد میں منہمک رہیں، اور سب سے زیادہ توجہ اپنی اور اپنے ساتھیوں کی اصلاح اور تزکیہ پر مرکوز رکھیں

(۲) اس دوران میں 'زبان' یعنی تحریر و تقریر کے ذریعے 'نہی عن المنکر' یعنی برائیوں اور خلافِ شریعت کاموں پر تنقید اور ملامت کا فریضہ پوری قوت سے سرانجام دیں لیکن نہ ملکی انتخابات میں حصّہ لیں نہ ہی کسی دوسرے سیاسی ہنگامے میں فریق بنیں۔

(۳) اس پورے عرصے کے دوران نہ کسی طنز و تضحیک اور تمسخر و استہزاء سے بددل ہوں نہ کسی جبر و تشدّد اور ایذاء و ابتلاء سے ہراساں ہوں بلکہ کامل صبر و تحمّل سے کام لیں اور ہرگز کوئی جوابی کارروائی نہ کریں۔

(ب) اور جب مناسب قوت فراہم ہو جائے تو راست اقدام کے طور پر : ——————

(۱) 'نہی عن المنکر بالید' یعنی قوت سے منکرات کے استیصال کے لئے کمر کس لیں۔

(۲) اس کے لئے جلسوں، جلوسوں، مظاہروں اور ناکہ بندیوں (پکٹنگ) کی شکل میں اجتماعی قوت و ارادہ کے اظہار کے تمام جدید ذرائع استعمال کریں —— اس شرط کے ساتھ کہ یہ سب کچھ بالکل پرامن ہو اور اس میں ان کی جانب سے کوئی تشدّد نہ ہو!

(۳) اور اگر ان پر تشدّد کیا جائے تو پورے صبر و مصابرت اور ثبات و استقلال کا مظاہرہ کریں حتّٰی کہ اس راہ میں جان دیدینے کو سب سے بڑی کامیابی سمجھیں۔

تا آنکہ "نَحْنُ الَّذِيْنَ بَايَعُوا مُحَمَّدًا عَلَى الْجِهَادِ مَا بَقِيْنَا اَبَدًا"[1] کے مصداق

یا حق کا بول بالا ہو جائے یا شہادت کی موت نصیب ہو جائے

---

[1] صحیح بخاری کی رُو سے یہ شعر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم غزوۂ احزاب میں خندق کھودتے وقت آواز میں آواز ملا کر پڑھتے تھے۔ ترجمہ "ہم ہیں وہ لوگ جنہوں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے آخری دم تک جہاد جاری رکھنے کی بیعت کی ہے"۔

تنظیم اسلامی کے امیر

ڈاکٹر اسرار احمد

ہیں جن کے ہاتھ پر تنظیم اسلامی کے رفقاء نے

ہجرت و جہاد فی سبیل اللہ اور سمع و طاعت فی المعروف

کی بیعت کی ہے

ہجرت: نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کی رُو سے ہجرت کا آغاز ترکِ معاصی سے ہو جاتا ہے' البتہ دل میں نیت رکھنی ضروری ہے کہ اگر کبھی غلبۂ دینِ حق کی جدّوجہد میں ضروری ہو تو اہل و عیال' گھر بار اور ملک و وطن سے بھی ہجرت اختیار کر لوں گا۔

جہاد: اسی طرح آنحضورؐ کے فرمان کے مطابق اصل جہاد تو اپنے نفس سے کرنا ہوتا ہے' تاہم دین کی دعوت و تبلیغ اور غلبہ و اقامت کی جدّوجہد میں جان اور مال کھپانے کی جملہ صورتیں جہاد فی سبیل اللہ میں داخل ہیں۔ البتہ دل میں یہ آرزو رکھنی ضروری ہے کہ کبھی خالص اللہ کے دین کے لئے قتال کی نوبت آئے تو اس میں حصہ لوں اور اللہ کی راہ میں گردن کٹا کر شہادت کا رتبہ حاصل کر لوں۔

سمع و طاعت: سے مراد ہے حکم سننا اور اس پر بے چون و چرا عمل کرنا' یہ معاملہ اللہ اور اس کے رسولؐ کے لئے تو غیر مشروط ہے لیکن آپؐ کے بعد کسی بھی انسان کے لئے 'فی المعروف' کی شرط کے ساتھ مشروط ہے۔ یعنی یہ کہ اس کا حکم اللہ اور اس کے رسولؐ کے کسی واضح اور صریح حکم کے خلاف نہ ہو' البتہ اس سے باہمی مشاورت کی نفی نہیں ہوتی جو نہایت ضروری اور لازمی ہے۔

بیعت: ایک معاہدہ ہے جس کی بہت سی قسمیں نبی اکرمؐ اور سلف صالحین سے منقول و ماثور ہیں۔ اس 'بیعتِ جہاد' سے بیعتِ ارشاد و سلوک کی نفی نہیں ہوتی۔ بلکہ یہ دونوں بیعتیں جُدا جُدا بھی ہو سکتی ہیں اور یکجا بھی۔

ڈاکٹر صاحب مرکزی انجمن خدّام القرآن لاہور (رجسٹرڈ)

کے صدر مؤسّس بھی ہیں اور اُن کی رہائش انجمن کی قائم کردہ

قرآن اکیڈمی' ۳۶' کے' ماڈل ٹاؤن' لاہور-۱۴

میں ہے جہاں انجمن کے مرکزی دفاتر بھی واقع ہیں۔

ٹیلیفون: ۸۵۲۶۱۱ — ۱۵۲۶۸۳

مرکزی دفتر تنظیمِ اسلامی پاکستان

۶۷-اے، علامہ اقبال روڈ - گڑھی شاہو - لاہور
(یہاں ابھی ٹیلیفون نہیں ہے فی الحال ٹیلیفونی رابطہ کیلئے انجمن خدام القرآن کے فون استعمال کئے جاسکتے ہیں)

مقامی دفاتر :

- ۱۱- داؤد منزل، شاہراہ لیاقت، نزد آرام باغ، کراچی (فون : ۲۱۶۵۸۶)
- ۲۷-۲۸، سید بلڈنگ، بالمقابل پبلک سیلیتھ اسکول، جناح روڈ، کوئٹہ (فون : ۷۸۸۱۹)
- ۲۵- آفیسرز کالونی، نزد لاسال ہائی اسکول، ملتان (فون : ۳۰۴۵۱)
- کمرہ نمبر ۴، لاثانی مارکیٹ، گول چنیوٹ بازار، فیصل آباد (فون: ۳۲۲۳۴-۴۲۰۵۰)
- مکان نمبر ۴۲ گلی نمبر ۳۲، سیکٹر F-6/1، اسلام آباد (فون: ۸۲۴۸۳۶)
- باڑا بازار، غلہ منڈی، پشاور صدر (فون : ۴۱۸۶۱)

تنظیم کی دعوت کو تفصیلاً سمجھنے کے لئے:

تنظیم کے لٹریچر اور امیر تنظیم کے دروس قرآن اور تقاریر کے کیسٹ اور تنظیم کے ترجمان ماہنامہ "میثاق" کا مطالعہ مفید ہوگا، اس کا پتہ: ۳۶-کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور
نیز مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کا ماہانہ مجلہ "حکمت قرآن" بھی وہیں سے شائع ہوتا ہے۔

تنظیمِ اسلامی میں شمولیت

کے لئے کسی بھی مسلمان (مرد یا عورت) کو امیر تنظیم سے بیعت کرتے ہوئے خلوصِ دل کے ساتھ صرف یہ عہد کرنا ہوگا کہ وہ تنظیم کے نظم کی پابندی کرے گا اور تنظیم کے طریق کار کے مطابق دین کی دعوت و اشاعت اور غلبہ و اقامت کے لئے حسب استطاعت تن من دھن صرف کریگا۔ اور اپنی زندگی میں مطلوبہ تبدیلی لانے کا عمل اللہ تعالیٰ کی توفیق و تائید کے بھروسے پر بلا تاخیر شروع کر دے گا!

ناشر : چودھری غلام محمد، قیم تنظیم اسلامی — مطبع : مکتبۂ جدید پریس، لاہور

ڈاکٹر اسرار احمد کی زیرِ تالیف تصنیف

استحکامِ پاکستان

شائع شدہ

۱- پاکستان کی عمر کا چالیسواں سال
۲- چند ذاتی وضاحتیں

باب اوّل

پاکستان کا عدمِ استحکام:
حقیقی واقعی یا وہمی وخیالی؟

باب دوم

پاکستان کی اصل اساس

باب سوم

استحکامِ پاکستان کی ٹھوس بنیاد

(زیرِ تالیف)

باب چہارم

کون سا اسلام؟

باب پنجم

موجودہ مسلمان معاشرے کا اسلام کے ساتھ عملی تعلق

باب چہارم

"کون سا اِسلام؟"

گذشتہ مباحث سے یہ بات اظہر من الشمس ہو چکی ہے کہ پاکستان پوری دنیا کا وہ واحد ملک ہے جس کی 'ولدیت' صرف اور صرف اسلام ہے۔ چنانچہ یہ قائم بھی دین و مذہب کے نام پر ہُوا اور اس کے بقاو دوام اور ترقی و استحکام کے لیے بھی نہ تاریخی تقدس کا عامل موجود ہے، نہ فطری جغرافیائی حدود کا حفاظتی ذریعہ اور نہ ہی دنیا کے معروف اور مروجہ معیارات کے مطابق کوئی قوم پرستانہ جذبہ ـــــ بلکہ اُسے مضبوط اور مستحکم اور ناقابلِ تسخیر بنا سکتا ہے تو صرف اور صرف مذہبی جذبہ! تو آیئے کہ اب ہم اُس مذہبی جذبے کی نوعیت اور حدود خال معین کرنے کی کوشش کریں جو پاکستان کے بقاو استحکام کی مضبوط اور پائدار اساس بن سکتا ہے اور یہ سمجھنے کی کوشش کریں کہ اسلام کی کونسی تعبیر اُس مذہبی جذبے کی پیدائش و افزائش کا ذریعہ بن سکتی ہے!

۱- قومی و نسلی نہیں بلکہ حقیقی اور عملی!

اِس ضمن میں اوّلین اور اہم ترین حقیقت جو سامنے آتی ہے وہ یہ کہ وہ مذہبی جذبہ جو پاکستان کے بقاو استحکام کا ضامن بن سکتا ہے بنیادی طور پر مختلف ہے اُس مذہبی جذبے سے جو اُس کے وجود میں آنے کا سبب بنا تھا! اِس لیے کہ اُس وقت مقابلہ غیر مسلموں سے تھا۔ لہٰذا ہر وہ شخص جو مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہُوا اور مسلمانوں کا سا نام رکھتا تھا، قومی تحریک میں نہ صرف شامل اور شریک ہو سکتا تھا،

بلکہ اُس کے قائدین تک کی صفوں میں بار پاسکتا تھا، قطع نظر اِس سے کہ اُس کے واقعی نظریات کیا تھے؟ اُس کے اخلاق اور کردار کا عالم کیا تھا اور وہ اسلام کے بنیادی احکام تک پر عمل پیرا تھا یا نہیں؟ حتیٰ کہ ارکانِ اسلام تک کا بھی پابند تھا یا نہیں۔؟ — چنانچہ اُس وقت "پاکستان کا مطلب کیا؟ لاالٰہ الاّ اللہ" کے بعد سب سے زیادہ مقبول نعرہ یہی تھا کہ "مسلم ہے تو مسلم لیگ میں آ!"

واقعہ یہ ہے کہ اُس وقت کی کشمکش میں ہمارے اندر اپنے مسلمان ہونے کا احساس زیادہ شدت کے ساتھ خود ہندوؤں کے طرزِ عمل اور رویّے کے باعث پیدا ہو رہا تھا۔ کہ جہاں کسی مسلمان کا ہاتھ اُن کے برتن کو چھُو گیا وہ "بھرشٹ" یعنی ناپاک ہو گیا۔ خواہ وہ مسلمان کتنا ہی صاف ستھرا اور نہایا دھویا کیوں نہ ہو اور وہ ہندو خود کتنے ہی گندے اور میلے کچیلے کیوں نہ ہوں! چنانچہ ہر ریلوے سٹیشن پر پینے کا پانی بھی اِس شان سے جُدا تھا کہ اگر 'مسلمان پانی' پلیٹ فارم کے ایک سرے پر ہوتا تھا تو 'ہندو پانی' اُس کے بالکل بالمقابل دوسرے سرے پر! — پھر خاص طور پر معاشی اور اقتصادی میدان میں ہندوؤں کی جانب سے مسلمانوں پر جس طرح عرصۂ حیات تنگ کرنے کی کوششیں ہو رہی تھیں، اُن کی چبھن اور کسک کو ہر مسلمان تاجر یہاں تک کہ کھوکھے والے اور خوانچہ فروش تک اور جملہ سرکاری ملازم یہاں تک کہ چوکیدار اور چپڑاسی تک محسوس کر رہے تھے۔ گویا کہ اُس وقت کے مسلم نیشنلزم میں جہاں مثبت اور حقیقی عوامل بھی کارفرما تھے وہاں ایک اہم اور مؤثر عنصر ابنائے وطن کے رویّے کا ردِّ عمل (REACTION) بھی تھا۔

اِس ضمن میں نومبر ۱۹۲۰ء میں جمعیتہ علماءِ ہند کے دوسرے کُل ہند اجلاس کے موقع پر اپنے خطبۂ صدارت میں جو کچھ فرمایا تھا مولانا حسین احمد مدنی رح کے استاذ اور مربّی حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ نے اُس کا مطالعہ بہت مفید اور بہت سوں کے لیے 'انکشافِ حقیقت' کا ذریعہ بنے گا۔ حضرت شیخ الہندؒ نے فرمایا تھا:

" ہاں یہ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں اور آج پھر کہتا ہوں کہ ان اقوام کی باہمی مصالحت

اور آشتی کو اگر آپ پائدار اور خوشگوار دیکھنا چاہتے ہیں تو اُن کی حدود کو خوب اچھی طرح دلنشین کر لیجئے۔ اور وہ حدود یہی ہیں کہ خدا کی باندھی ہوئی حدود میں اُن سے کوئی رخنہ نہ پڑے، جس کی صورت بجز اس کے کچھ نہیں کہ صلح و آشتی کی تقریب سے فریقین کے مذہبی امور میں سے کسی ادنیٰ امر کو بھی ہاتھ نہ لگایا جائے اور دنیوی معاملات میں ہرگز کوئی طریقہ ایسا نہ اختیار کیا جائے جس سے کسی فریق کی ایذا رسانی اور دل آزاری مقصود ہو۔ مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اب تک بہت جگہ عمل اس کے خلاف ہو رہا ہے۔ مذہبی معاملات میں تو بہت سے لوگ اتفاق ظاہر کرنے کے لیے اپنے مذہب کی حد سے گذر جاتے ہیں لیکن محکموں اور ابوابِ معاش میں ایک دوسرے کی ایذا رسانی کے درپے رہتے ہیں۔ میں اس وقت جمہور سے خطاب نہیں کر رہا ہوں بلکہ میری گذارش دونوں قوموں کے زعماء (لیڈروں) سے ہے کہ ان کو جلسوں میں ہاتھ اٹھانے والوں کی کثرت اور ریزولیوشنوں کی تعداد سے دھوکا نہ کھانا چاہیئے کہ یہ طریقہ سطحی لوگوں کا ہے اور ان کو ہندو مسلمانوں کے نجی معاملات اور سرکاری محکموں میں متعصبانہ رقابتوں کا اندازہ کرنا چاہیئے!"

(بحوالہ 'بیس بڑے مسلمان' تالیف مولانا عبدالرشید ارشد، ص۲۹۱)

ذرا اندازہ فرمایئے حضرت شیخ الہندؒ کی دُور اندیشی اور ژرف نگاہی کا کہ یہ ۱۹۲۰ء کا دَور ہے۔ جبکہ ہندوستان میں ہندو اور مسلمان بظاہر شیر و شکر ہیں اور تحریکِ آزادی میں قدم بہ قدم اور شانہ بشانہ شریک ہیں اور خود محمد علی جناح جو اُس وقت تک 'قائدِ اعظم' نہیں بنے تھے ہندو مسلم اتحاد کے سفیر اور محبت و یگانگت کے سب سے بڑے داعی اور علمبردار ہیں لیکن وہ مردِ درویش اُس ظاہری رواداری کے پردے میں ہندو کی اصل ذہنیت کا اندازہ کر چکا ہے اور واضح اور غیر مبہم الفاظ میں تنبیہہ کر رہا ہے کہ اگر برادرانِ وطن کا رویّہ یہی رہا تو ہمیں بھی اپنے طرزِ عمل پر نظرِ ثانی کرنی ہوگی۔

اِس کے بعد فوراً بعد آتا ہے تحریکِ خلافت کا طوفانی اور ہیجانی دَور جس میں ہندوؤں کو مسلمانوں کا حاشیہ بردار اور تابع (CAMP FOLLOWER) بننے ہی میں

عافیت نظر آتی ہے۔ چنانچہ اُس جذباتی اور ہنگامی دَور میں تو مسلمان اور ہندو واقعتہً شیر وشکر نظر آتے ہیں ــــــ لیکن جب تحریکِ خلافت دفعتاً بالکل اُسی انداز میں ختم ہو جاتی ہے جیسے تیز بخار پسینہ آنے سے یکدم اُتر جاتا ہے تو صورتِ حال میں ایک فوری تبدیلی آتی ہے ــــــ کہ ایک جانب مسلمانوں میں شدید دل شکستگی کی کیفیت پیدا ہوئی، اُن کے ولولے سَرد پڑے اور ایک عام بددلی اور مایوسی کی فضا طاری ہو گئی اور دُوسری جانب (غالباً مسلمانوں کی اِس عمومی کیفیت ہی سے حوصلہ پاکر) ہندو ذہنیت کھل کر سامنے آئی۔ چنانچہ کہیں اُس نے 'شدھی اور سنگھٹن' کا رُوپ دھارا تو کہیں 'وارد ھا اسکیم' کی صورت اختیار کی، اور کہیں 'ہندو مہاسبھا' کی شکل میں ظہور کیا تو کہیں راشٹریہ سیوک سنگھ کی صورت میں جلوہ گر ہوئی ــــــ نتیجتہً ہندوستان میں ہندو مسلم کشمکش کے شدید ترین دَور کا آغاز ہو گیا اور مسلم قوم پرست تحریک اپنے نقطۂ عروج کی جانب تیزی کے ساتھ منزلیں طے کرتے ہوئے بڑھنے لگی۔ اِس طرح کم ازکم مسلمانانِ ہند کے ضمن میں ہندو کی تنگ نظری اور استحصالی ذہنیت کے بارے میں وہ بات کمالِ صداقت کے ساتھ کہی جاسکتی ہے جو علاّمہ اقبال نے یورپی استعمار کے بارے میں کہی تھی:

ع "مسلماں کو مسلماں کر دیا طوفانِ مغرب نے!"

اور قیامِ پاکستان کے ضمن میں ہندوؤں کے اِس طرزِ عمل پر بجا طور پر اُن کا شکریہ ادا کیا جاسکتا ہے کہ ؎

"تُونے اچھا ہی کیا دوست سہارا نہ دیا
مجھ کو لغزش کی ضرورت تھی سنبھلنے کے لیے!"

بہرحال اِس گھمسان کے رَن میں ظاہر ہے کس کے پاس فرصت تھی اور کسے ہوش تھا کہ یہ دیکھے کہ کون اسلام پر واقعتہً عمل پیرا ہے اور کون اُس کے کم ازکم لوازم و شرائط پر بھی پُورا نہیں اُترتا ــــ اُس وقت تو واحد امتیاز کلمۂ شہادت کا تھا کہ کون کلمہ گو ہے اور کون نہیں! چنانچہ تحریکِ پاکستان کی اساس مسلم قومیت قرار پائی نہ کہ اسلام کے

ساتھ واقعی اور عملی تعلق! اور یہ ہتھیار واقعتہً اُس وقت بہت کارگر اور مؤثر ثابت ہُوا۔ چنانچہ اُسی کی اساس پر تحریک نے عوامیت اختیار کی اور کامیابی حاصل کرلی اور قیامِ پاکستان کا 'معجزہ' ظہور میں آگیا۔

تقسیم کے بعد حالات یکسر تبدیل ہوگئے۔ مغربی پاکستان میں ہندو نہ ہونے کے برابر رہ گئے اور جو رہ گئے انہوں نے بھی کم از کم وقتی طور پر گویا دم سادھ لیا۔ چنانچہ ہندو مسلم کشمکش مغربی پاکستان کی حد تک بالکل ختم ہوگئی۔ رہے بھارت کے حالات تو وہ بین الاقوامی سرحدوں کے پردوں میں چھپ کر "آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل" کے مصداق بن گئے۔ نتیجتہً جب تک تقسیم کے وقت کے زخموں میں ٹیسیں اُٹھتی رہیں اور کسک باقی رہی سابقہ کشمکش کی یاد بھی برقرار رہی لیکن وقت گذرنے کے ساتھ رفتہ رفتہ اُس کے اثرات بھی زائل ہوگئے اور یاد بھی باقی نہ رہی ——— رہا مشرقی پاکستان تو وہاں اگرچہ ایک فعّال اور مؤثر ہندو اقلیت قابلِ لحاظ تعداد میں موجود تھی لیکن اُس نے کمال ہوشیاری اور چابکدستی سے کام لے کر وہاں کی مسلم اکثریت کے مسابقت اور مقابلے کے جذبے کا رُخ اپنی جانب سے پھیر کر مغربی پاکستان کی طرف کر دیا اور خود خاموشی کے ساتھ ایک بغلی دشمن کے انداز میں ایک لسانی اور ثقافتی قومیت کے تصوّر کو اُبھارنے اور اُجاگر کرنے میں لگ گئے۔ جس کا نتیجہ پچیس سال کے اندر اندر پاکستان کی شکست اور بنگلہ دیش کے قیام کی صورت میں ظاہر ہُوا جس پر پاکستان اور نظریۂ پاکستان کے دشمنوں کے گھروں میں گھی کے چراغ جلے اور اُنہیں یہ کہنے کا موقع ملا کہ دُو قومی نظریہ باطل (FALSE) ثابت ہوگیا ہے! ——— اور اِس کے بعد یہی طریقِ کار (STRATEGY) 'بچے کھچے پاکستان' میں چھوٹے صوبوں، بالخصوص سندھ کی ہندو اقلیت اپنائے ہوئے ہے۔ چنانچہ اُس نے بھی سندھ کی قدیمی مسلمان آبادی کی اکثریت کی مخالفت اور نفرت کا رُخ پنجاب کی جانب موڑ کر خود ایک لسانی اور ثقافتی قومیت کے دامن میں پناہ لی ہوئی ہے اور بظاہر احوال تو یہی نظر آتا ہے کہ 'سندھو دیش' کی تحریک بھی سندھ کی نوجوان نسل کے

معتد بہ حصّے کو اپنی لپیٹ میں لے چکی ہے۔ واللہ اعلم!

بنا بریں اب وہ مسلم قوم پرستی جس کے شعور کی گیرائی و گہرائی میں ایک فیصلہ کُن حصّہ برِّصغیر کی ہندو مسلم کشمکش کی شدّت کا تھا ایک مؤثر اور قابلِ لحاظ عامل کی حیثیت سے موجود ہی نہیں ہے۔ گویا مذہبی جذبے کی وہ قسم جو پاکستان کے قیام کا ذریعہ بنی تھی اب نہ صرف یہ کہ غیر مؤثر اور دُور از کار (OBSOLETE) ہو چکی ہے بلکہ فی الواقع موجود ہی نہیں ہے۔ اِس لیے کہ پاکستان کی نئی نسل کو نہ صرف یہ کہ ہندو ذہنیت کا کوئی تجربہ نہیں ہُوا بلکہ اس کے برعکس اُسے تو آئے دن محبت کے اُن زمزموں، سے سابقہ پیش آتا ہے جو سرحد پار سے ہَوا کے دوش پر ریڈیو اور ٹی وی کے ذریعے پہنچتے رہتے ہیں یا جن کی یلغار مسلسل دانشوروں، شاعروں اور ادیبوں اور صحافیوں — اور سب سے بڑھ کر ثقافتی طائفوں کے ذریعے ہوتی رہتی ہے! —

صرف یہی نہیں، بلکہ اِس سے بڑھ کر یہ کہ اب پاکستان میں عمودی (VERTICAL) اور اُفقی (HORIZONTAL) تقسیم اور محاذ آرائی (POLARISATION) نے خود پاکستانی مسلمانوں کو باہم منقسم اور ایک دوسرے کے بالمقابل کھڑا کر دیا ہے۔ چنانچہ ایک جانب علاقائی، لسانی اور ثقافتی تقسیم کی گہرائی اور گیرائی میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے تو دوسری جانب طبقاتی تقسیم کا شعور بھی رفتہ رفتہ بڑھ رہا ہے۔ لہٰذا اب پاکستان کے مسلمانوں میں مقاصد کی یک جہتی اور ہم آہنگی صرف مسلم قومیّت کے تصوّر اور محض قوم پرستانہ جذبے کی بنیاد پر پیدا نہیں ہو سکتی بلکہ اب انہیں کوئی شے "بنیان مرصوص" (سورۃ صف آیت ۴) : سیسہ پلائی ہوئی دیوار) بنا سکتی ہے تو صرف وہ مذہبی جذبہ ہو سکتا ہے جو اسلام کے ساتھ حقیقی تعلق اور کردار و عمل کے واقعی رشتے سے پیدا ہوا اور اُسی سے غذا حاصل کرے اور نشو و نما پائے!!

یہی بات راقم نے ایک ملاقات میں پاکستان کے بزرگ صحافی جناب

زیدؔ اے سلہری سے عرض کی تھی کہ آپ کا تقریباً ہر مضمون 'دو قومی نظریئے' (TWO NATION THEORY) پر مبنی ہوتا ہے اور آپ کی ہر تحریر کی تان لازماً مسلم قومیت (MUSLIM NATIONHOOD) ہی پر ٹوٹتی ہے ـــــ تو جہاں تک اِس حقیقت کا تعلق ہے کہ پاکستان اسی کی بنیاد پر قائم ہُوا تھا تو میرے خیال میں کوئی نہایت ہی ڈھیٹ قسم کا انسان ہی ہوگا جو اِس سے انکار کی جرأت کرے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ جس انداز سے آپ اس کی تکرار کر رہے ہیں اور ڈھنڈورا پیٹ رہے ہیں اُس سے تو اُلٹا اِس شک کے پیدا ہونے کا امکان ہے کہ پاکستان کی 'ایجاد و تکوین' (GENESIS) کے ضمن میں شاید کوئی اور دوسرا قوی تر نظریہ بھی موجود ہے جس کی اِس تکرار اور اعادے اور شدّ و مد کے ساتھ نفی اور تردید کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے ـــ اصل قابلِ غور اور اہمیت کی حامل حقیقت یہ ہے کہ محض مسلم قومیت اَب پاکستان کے بقاء و استحکام کی ضامن نہیں بن سکتی جب تک اُس میں حقیقت اور واقعیت کا رنگ نمایاں طور پر نظر نہ آئے اور فعل و عمل کی رُوح واضح طور پر جاری و ساری محسوس نہ ہو!!

۲- جدید دانشورانہ اسلام نہیں بلکہ عُلماء کا مصدّقہ اسلام!

دُوسری اہم اور بنیادی بات جو اُس مذہبی جذبے کے بارے میں اچھی طرح سمجھ لینی چاہیئے جو پاکستان کے بقاء و استحکام کے لیے ٹھوس بنیاد بن سکے یہ ہے کہ وہ اسلام کی کسی جدید دانشورانہ تعبیر کے ذریعے پیدا نہیں کیا جا سکتا بلکہ اُس کے لیے اسلام کی صرف وہی تعبیر مؤثر اور کارگر ہوگی جو صدیوں کے تعامُل اور 'روایت' کی بنا پر مسلمانوں کے اجتماعی شعور (COLLECTIVE CONSCIOUNESS) کا جزوِ لاینفک بن چکی ہے۔ اور جسے علماءِ کرام کی تصدیق حاصل ہے جن پر

دین و مذہب کے معاملے میں مسلمان عوام کی عظیم اکثریت اعتماد کرتی ہے۔ اِس لیے کہ موضوعِ زیرِ بحث کے اعتبار سے ہم ایک ایسے جذبے کی بات کر رہے ہیں جو عوام میں ذہنی، فکری اور جذباتی ہم آہنگی پیدا کرے اور اُن کو محنت و مشقت اور ایثار و قربانی پر آمادہ (MOTIVATE) کر سکے اور ظاہر ہے کہ یہ مقصد کسی جدید تعبیر کے ذریعے حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ اِس لیے کہ جدید تعبیرات اور دانشورانہ تصوّرات تو زیادہ سے زیادہ ذہین اقلیت (INTELLECTUAL MINORITY) بلکہ اُس کے بھی ایک حصّے ہی کو متاثر کر سکتے ہیں، عوام کے قلوب و اذہان کو بڑے پیمانے پر مسخّر نہیں کر سکتے — اور جب تک جذبہ و امنگ کا عوامی سطح پر ظہور نہ ہو ہمارا مقصود یعنی پاکستان کے مسلمانوں کا ایک بنیانِ مرصوص بن کر ناقابلِ تسخیر قوت کی صورت اختیار کر لینا حاصل نہیں ہو سکتا۔

اِس ضمن میں یہ حقیقت بھی پیشِ نظر رہنی چاہیئے کہ مسلمانوں کی چودہ سو سالہ تاریخ بہت سے بدنما داغوں اور دھبّوں کے باوجود بالکل 'تاریک' نہیں ہے اور اس کے دوران سیاسی مدّ و جذر اور حکومتی سطح پر ردّ و بدل، توڑ پھوڑ اور آمد و رفت کے باوصف ایک تہذیبی اور ثقافتی تسلسل موجود رہا ہے جس میں اصل عمل دخل دو طبقوں کے اثر و نفوذ کو حاصل رہا ہے: ایک علماء کرام اور دوسرے صوفیاء عظام۔ اور خواہ مسلمانوں کے جسموں پر حکومت امراء و سلاطین کی رہی ہو اُن کے قلوب و اذہان اور احساسات و جذبات پر علماء اور صوفیاء ہی کی سیادت و قیادت کا سکّہ چلتا رہا ہے اور اجتماعات و عمرانیات پر نگاہ رکھنے والا ہر شخص جانتا ہے کہ یہ کیفیت پورے عالمِ اسلام کی بہ نسبت مسلمانانِ برِّصغیر میں شدید ترین صورت میں موجود ہے۔ اور یہاں کا مسلمان خواہ کسی خارجی جبر کے باعث یا نفسِ امّارہ کے داخلی دباؤ کے تحت خود اس اسلام پر پوری طرح عمل پیرا اور کاربند نہ ہو جو علماءِ کرام پیش کرتے ہیں لیکن دل کی گہرائیوں سے قائل اُسی کا ہے۔ اور یہ صرف چودھویں صدی ہجری کے نصف کے بعد ہُوا کہ

مسلمانوں کی عوامی سیاست کی قیادت ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں چلی گئی جو دین و مذہب سے کوئی گہرا عملی لگاؤ نہیں رکھتے تھے، تاہم اِس سلسلے میں بھی یہ حقیقت ناقابلِ تردید ہے کہ اِس قیادت کو عملاً عوامی پذیرائی اُس وقت حاصل ہوئی جب اُسے مسلّمہ حیثیت کے حامل مشائخ اور علماء کی معتدبہ تعداد کی تصدیق اور سند حاصل ہو گئی ـــــ بنابریں وہ مذہبی جذبہ جو پاکستان کے بقاء و دوام اور ترقّی و استحکام کا ضامن بن سکتا ہے نہ دین و مذہب کی کسی جدید تعبیر کی بنیاد پر پیدا ہو سکتا ہے نہ کسی نئے دانشورانہ تصور کی اساس پر۔ بلکہ اس کی پیدائش و افزائش کا کوئی امکان اگر ہے تو دین و مذہب کے صرف اور صرف اُن تصورات اور تعبیرات کی بنا پر ہے جن کی 'اسلامیت' نہ صرف یہ کہ مسلمان عوام کے اجتماعی شعور کے نزدیک مسلّم اور قابلِ قبول ہو بلکہ اُن کے تحت الشعور میں رچی بسی ہو حتّٰی کہ اُن کے لاشعور تک میں نفوذ کیے ہوئے ہو۔ اور اس میں ہرگز کوئی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ یہ تعبیرات اور تصورات وہی ہو سکتے ہیں جنہیں علماء کی تصدیق حاصل ہو۔

اِس سلسلے میں اِس خیال کو بھی دل سے نکال دیا جائے کہ علماء تو خود آپس میں دست و گریبان ہیں اور اُن کے درمیان اتنے شدید اختلافات موجود ہیں کہ خود جمع نہیں ہو سکتے تو اُن کے مصدقہ تصورات قوم کو کیسے جمع کر دیں گے؟ اِس لیے کہ اگرچہ اِس حقیقت سے تو کلّی انکار ممکن نہیں ہے کہ ہمارے یہاں جہاں علمائے حق معتدبہ تعداد میں موجود ہیں وہاں ایسے 'علماءِ سُوء' کی بھی یقیناً کمی نہیں ہے جو خالصتاً "بَغْیًا بَیْنَھُمْ" کی بنا پر (یہ الفاظ قرآنِ حکیم میں چار مقامات پر باہمی جنگ و جدال اور تشتت و انتشار کے اصل سبب کی تعیین کے ضمن میں وارد ہوئے ہیں ـ دیکھیے سورۃ البقرہ آیت ۲۱۳، سورہ آلِ عمران، آیت ۱۹، سورۃ شوریٰ آیت ۱۴، اور سورۃ جاثیہ آیت ۱۷) یعنی آپس کی ضدم ضدا اور ایک دوسرے پر برتری اور فوقیت کے حصول کے لیے مسلمانوں

کے فروعی اختلافات کو اُبھارتے ہیں اور انہیں آپس میں لڑا کر اپنا اُلّو سیدھا کرتے ہیں، تاہم پاکستان کی چالیس سالہ تاریخ کے دوران بحیثیتِ مجموعی علماءِ کرام کا کردار مثبت اور منفی دونوں اعتبارات سے یعنی مثبت طور پر پاکستان میں اسلامی دستور و قانون کے نفاذ و اجراء اور منفی اعتبار سے اسلام کے مسلّمہ اعتقادات و تعلیمات کے خلاف اُٹھنے والے فتنوں کے سدِّباب دونوں پہلوؤں سے ہرگز مایوس کن نہیں بلکہ بحمداللہ نہایت روشن اور تابناک رہا ہے۔ چنانچہ ایک جانب جب دستور سازی کے ضمن میں ایوانِ اقتدار سے یہ شوشہ چھوڑا گیا کہ پاکستان میں کس کا اسلام نافذ کیا جائے، شیعہ کا یا سُنّی کا؟ اہلحدیث کا یا حنفی کا؟ اور بریلوی کا یا دیوبندی کا؟ تو اِس چیلنج کے جواب میں جملہ مکاتبِ فکر کے ۳۱ سربرآوردہ علماءِ کرام نے کامل اتفاقِ رائے کے ساتھ ۲۲ نکاتی فارمولا پیش کرکے وہ حجتِ قاطع قائم کردی تھی جو اَب تک قائم ہے اور جس کا جواب بعد میں کسی سے بھی بن نہیں آیا! —— اِسی طرح عقیدۂ ختمِ نبوّت کی فصیل میں نقب لگانے والوں کے خلاف ۱۹۵۳ء اور ۱۹۷۴ء میں دو بار جملہ مسلکوں اور فرقوں کے علماءِ کرام نے جس اتحاد و اتفاق کا ثبوت دیا وہ بھی ہماری تاریخ کا نہایت تابندہ و درخشندہ باب ہے!! اور اللہ کا شکر ہے کہ بالکل یہی کیفیت ہمارے یہاں فتنۂ انکارِ حدیث کے ضمن میں بھی پائی جاتی ہے! (ذرا دقّتِ نظر سے جائزہ لیا جائے تو اِن دونوں فتنوں کے ڈانڈے باہم ملے ہوئے نظر آئیں گے۔ اِس لیے کہ نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی ذاتِ مبارک پر نبوّت و رسالت کا خاتمہ و تکمیل اور اُس کے لازمی منطقی نتیجے کے طور پر اَب ابدالآباد تک آپؐ کی سُنّت کی حجیّت اور آپؐ کے اتباع کا لزوم ہی تجدّد پسندی اور مغرب پرستی کی راہ کے اصل پتھر ہیں اور یہ دونوں فتنے درحقیقت اِن ہی سے گلوخلاصی کی دو بظاہر قدرے مختلف صورتیں ہیں!) —— اِس پر مستزاد ہیں یہ دو مثالیں کہ اوّلاً آج سے تین چار سال قبل جب راقم کے ایک اخباری انٹرویو میں سترِ حجاب سے متعلق

اسلام کے احکام بیان ہوئے اور اُس پر ملک بھر میں اباحیت پسند اور مغرب زدہ خواتین و حضرات نے طوفان برپا کر دیا تو بلالحاظِ مسلک و مشرب پاکستان کی ہر مسجد کے محراب و منبر سے میری تائید میں آواز بلند ہوئی اور اگرچہ جدید دانشور حضرات و خواتین نے میرے خلاف مضامین کا طومار باندھ دیا جو قومی اخبارات کے رنگین صفحات میں جلی سُرخیوں اور دیدہ زیب حاشیوں کے ساتھ شائع ہوئے۔ لیکن بالآخر خود اِسی حلقے کے ایک نمایاں دانشور اور صحافی (جناب صفدر میر) کو یہ ماننا پڑا کہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر اسرار نے حصولِ مقبولیت کے فن پر بہت کتابیں پڑھی ہیں تو اِس سے قطع نظر کہ راقم نے زندگی بھر اِس موضوع پر کوئی کتاب پڑھنا تو کجا دیکھی بھی نہیں —— اُن کے یہ الفاظ درحقیقت مظہر ہیں اُن کے اِس اعتراف کا کہ پاکستان کے مسلمان عوام خواہ خود اُس پر پوری طرح عمل پیرا نہ ہوں لیکن بہرحال قائل اُسی اسلام کے ہیں جسے علماءِ کرام کی تائید و توثیق حاصل ہے —— ثانیاً جب مُلک میں قانونِ شہادت اور قانونِ قصاص و دیت کی بحث چھڑی تو اُس کے ضمن میں پھر یہ بات الم نشرح ہو گئی کہ علماءِ کرام اپنے تمام تر اختلافات کے علی الرغم اسلامی قانون اور اُس کی فروعات تک کے ضمن میں بالکل متحد و متفق ہیں۔ حتیٰ کہ ایک خاص مکتبِ فکر کے چوٹی کے علماء نے ایک ایسے جدید دانشور کی تردید و تغلیط میں بھی کوئی تامل نہیں کیا جو اپنے آپ کو خود اُنہی کی جانب منسوب کرتے ہیں! قِصّہ مختصر یہ کہ پاکستان کے مسلمان عوام کی عظیم اکثریت کو آمادۂ عمل (MOTIVATE) کر کے اُنہیں ایک بنیانِ مرصوص اور ناقابلِ تسخیر قوت بنا دینے کی صلاحیت و استعداد صرف اُس مذہبی جذبہ میں ہے جو اسلام کے اُس تصور کی بنیاد پر اُبھرے جسے علماء کرام کی تصدیق و تصویب حاصل ہو!

۳- جامد مذہبیت نہیں بلکہ انقلابی دینی جذبہ

اُس مذہبی جذبے کی عرضِ ثالث (THIRD DIMENSION) جو پاکستان کے دوام و استحکام کی مؤثر و محکم بنیاد بن سکتا ہے یہ ہے کہ اِس میں 'جمود' کی بجائے 'حرکت'، اور اجتماعی نظام کو جُوں کا تُوں رکھنے یعنی (STATUS QUO) کو MAINTAIN کرنے کی بجائے تبدیلی اور انقلاب کی رُوح کارفرما ہو۔ اِس لیے کہ پاکستان کا داخلی انتشار اور اس کی یک جہتی و سالمیت اور باوقار و باعزت آزادی و خود اختیاری کے خلاف خارجی یلغار دونوں کی نوعیت ایک سیلاب کی سی ہے اور ظاہر ہے کہ سیلاب کا مقابلہ جمود کے ذریعے نہیں کیا جا سکتا بلکہ اِس کے لیے ایک والہانہ جذبے کی ضرورت ہے جو جوابی سیلاب کی صورت اختیار کرلے۔ بقول علامہ اقبال مرحوم ؏ :

"عشق خود اِک سیل ہے سیل کو لیتا ہے تھام!"

اور الحمدللہ کہ ہمیں اِس کے لیے ہرگز نہ کسی تکلف یا تصنع کی ضرورت ہے نہ کسی جدید نظریئے اور نظام کے دَر پر مرعوبانہ اور مقلدانہ دریوزہ گری کی احتیاج! اِس لیے کہ: اوّلاً اسلام اپنی اصل کے اعتبار سے ہے ہی ایک انقلابی تحریک اور یہ اِس بنا پر کہ اسلام صرف 'مذہب' نہیں کامل 'دین' ہے جو صرف عقائد عبادات اور چند معاشرتی و سماجی رسومات سے عبارت نہیں ہے بلکہ ان سب پر مستزاد ایک کامل و اکمل، متوازن و معتدل اور عادلانہ و منصفانہ معاشرتی، معاشی اور سیاسی نظام پر مشتمل ہے اور از روئے قرآنِ حکیم بعثتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا مقصد ہی اِس نظامِ حق کا پورے نظامِ زندگی پر غلبہ ہے۔ بفحوائے الفاظِ قرآنی: "هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ" (سورۃ توبہ آیت ۳۳، سورۃ فتح آیت ۲۸، اور سورۃ صف آیت ۹) یعنی "وہی ہے

(اللہ) جس نے بھیجا اپنے رسول (محمدؐ) کو الہدیٰ (قرآن حکیم) اور دینِ حق (اسلام) کے ساتھ تاکہ غالب کر دے اُسے کُل کے کُل دین (نظامِ زندگی) پر!" اور اِسی مقصد کے حصول و تکمیل کے لیے جدّ و جہد اور اس کے ضمن میں بذلِ نفس اور انفاقِ مال کی پُرزور دعوت دیتا ہے قرآنِ حکیم ایمان کے تمام دعویداروں کو "جہاد فی سبیل اللہ" کی فرضیت کے عنوان سے بفحوائے الفاظِ قرآنی، (ترجمہ) "اے اہلِ ایمان! کیا میں تمہیں وہ تجارت بتاؤں جو تمہیں عذابِ الیم سے چھٹکارا دلا دے؟ ایمان پختہ) رکھو اللہ اور اُس کے رسولؐ پر اور جہاد کرو اللہ کی راہ میں اپنے اموال اور جانوں کے ساتھ!" (سورۃ صف آیات ۱۰/۱۱) اور اِس جہاد فی سبیل اللہ کو شرطِ لازم اور رُکن رکین قرار دیتا ہے ایمانِ حقیقی کا، سورۃ الحجرات کی آیت ۱۵ کی رُو سے (ترجمہ) "مومن تو صرف وہ ہیں جو ایمان لائے اللہ اور اُس کے رسولؐ پر، پھر ہرگز شک میں مبتلا نہیں ہوئے اور جہاد کیا انہوں نے اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور جانوں کے ساتھ، صرف یہی لوگ (دعوئ ایمان میں) سچے ہیں!" گویا ؎

"مری زندگی کا مقصد ترے دیں کی سرفرازی
مَیں اِسی لیے مسلماں، مَیں اسی لیے نمازی!"

کے مصداق پورے نظامِ زندگی پر اللہ کے عطا کردہ کامل سماجی و معاشی و سیاسی نظام (SOCIO-POLITICO ECONOMIC SYSTEM) کا غلبہ ہر بندۂ مومن کی زندگی کا اصل مقصد اور اُس 'جہادِ زندگانی' کا اصل ہدف ہے جس کے لوازم و شرائط اور اوزار و ہتھیار ہیں: ایمان و یقین کی دولت، پیہم سعی و جہد کا مادّہ اور محبت اور اخوت کی قوتِ تسخیر، بقول علامہ اقبال مرحوم ؎

"یقینِ محکم، عملِ پیہم، محبت فاتحِ عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مَردوں کی شمشیریں"

ثانیاً: ہم پر اللہ تعالیٰ کا مزید فضل و کرم یہ ہے کہ وطنِ عزیز پاکستان

قائم ہی دین کے اِس حرکی تصوّر (DYNAMIC CONCEPT) پر ہُوا تھا۔ چنانچہ ایک جانب پاکستان کے بانی و مؤسّس قائدِ اعظم محمد علی جناح مرحوم نے واضح طور پر یہ بھی فرمایا تھا کہ "ہم پاکستان اِس لیے حاصل کرنا چاہتے ہیں کہ اِس کے ذریعے عہدِ حاضر میں اسلام کے ابدی اور زرّیں اصولِ حریّت و اخوّت و مساواتِ انسانی (HUMAN FREEDOM, FRATERNITY & EQUALITY) کا عملی نمونہ پیش کریں۔" (روایت بالمعنیٰ) اور ایک موقع پر پاکستان کے دستور کے بارے میں ایک سوال کے جواب میں بھی ارشاد فرمایا تھا کہ "ہمارا دستور آج سے چودہ سو سال قبل قرآن کی شکل میں مدوّن ہو گیا تھا!" (روایت بالمعنیٰ) اور دوسری جانب مفکّر و مصوّرِ پاکستان علّامہ اقبال نے اپنی زندگی کے آخری ایّام کی الہامی نظم "ابلیس کی مجلسِ شوریٰ" میں ابلیس کی زبانی ابلیسی قوّتوں کو لاحق ہونے والے سب سے بڑے خطرے اور اندیشے کی نشاندہی کی تھی یعنی ؎ "عصرِ حاضر کے تقاضاؤں سے ہے لیکن یہ خوف

ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبر کہیں ! "

تو اِس کے ضمن میں نہ صرف یہ کہ اسلام کے پورے سماجی، سیاسی اور اقتصادی نظام کے بنیادی اصولوں کو دریا کو کوزے میں بند کرنے کے انداز میں بیان کر دیا تھا بلکہ دراصل تحریکِ پاکستان کا پورا مُنشور (MANIFESTO) پیش کر دیا تھا ؎

" الحذر ! آئینِ پیغمبر سے سو بار الحذر !
حافظِ ناموسِ زن، مرد آزما، مرد آفریں
موت کا پیغام ہر نوعِ غلامی کے لیے
نے کوئی مغفور و خاقاں نے گدائے رہ نشیں
کرتا ہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک صاف
منعموں کو مال و دولت کا بناتا ہے امیں
اِس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب
پادشاہوں کی نہیں اللہ کی ہے یہ زمیں ! "

نہ صرف یہ بلکہ علامہ اقبال نے تو خاص طور پر موجودہ ظالمانہ اور استحصالی معاشی نظام کے استیصال اور بیخ کنی کے لیے باضابطہ 'انقلاب' کا نعرہ بھی بلند کر دیا تھا ؎ " خواجہ از خونِ رگِ مزدور سازد لعلِ ناب

از جفائے دِہ خدایاں کشتِ دہقاناں خراب

انقلاب

انقلاب ــــ اے ــــ انقلاب

اِس ضمن میں کسی کو یہ مغالطہ یا اندیشہ لاحق نہ ہو کہ اگر سرمایہ داری اور زمینداری کے خلاف انقلابی نعرہ لگایا گیا تو یہ اسلام کی بجائے کسی اور 'ازم' کی جانب رجوع و التفات ہو گا اِس لیے کہ واقعہ یہ ہے کہ شخصی آزادی کو برقرار رکھتے ہوئے ان دونوں کی جڑیں جس طرح اسلام کاٹتا ہے اور کوئی نظام نہیں کاٹ سکتا۔ چنانچہ 'ربوا' کی قطعی اور مؤکد ترین حرمت کے ذریعے 'سرمایہ داری' کی بیخ کنی ہو جاتی ہے، اگرچہ 'سرمایہ کاری' کے لیے صحت مند فضا، یہاں تک کہ اُس کے ضمن میں مقابلہ و مسابقت تک کا میدان برقرار رہتا ہے۔ اِسی طرح خواہ امامِ اعظم امام ابو حنیفہؒ اور امام دارالہجرت امام مالکؒ کے متفقہ فتویٰ کو اختیار کر لیا جائے کہ مزارعت (ABSENTEE LANDLORDISM) کی ہر صورت حرامِ مطلق ہے خواہ فقہ حنفی کے اِس فتوے پر عمل کر لیا جائے کہ مفتوحہ ممالک کی اراضی کسی کی انفرادی ملکیت نہیں ہوتیں بلکہ اسلامی ریاست کی اجتماعی ملکیت ہوتی ہیں دونوں صورتوں میں جاگیرداری اور مروّجہ زمینداری کا قلع قمع ہو جاتا ہے۔ (اپنے حالیہ سفرِ ابوظبی کے موقع پر ایک اہم اور قابلِ اعتماد شخصیت کے ذریعے معلوم ہُوا کہ ملکِ شام کے بعثی انقلاب سے پہلے کے دَور کے ایک صدر نے جو آج کل ابوظبی میں جلاوطنی کی زندگی گذار رہے ہیں اُنھیں یہ بتایا کہ شام میں ۱۹۴۵ء تک سابقہ خلافتِ عثمانیہ ہی کا بندوبستِ اراضی چل رہا تھا اور اُس کی رُو سے کل اراضی

بیت المال کی ملکیت تھیں۔ آئندہ وہاں جانا ہُوا تو اِن شاء اللہ اُن صاحب سے خود ملاقات کر کے توثیق حاصل کروں گا!)

الغرض پاکستان کے بقا و دوام اور اُس کی ترقّی و استحکام کی واحد ممکنہ اساس وہ مذہبی جذبہ بن سکتا ہے جو قومی و نسلی نہیں بلکہ حقیقی و عملی اسلام — اور اُس کی بھی کسی متجدّدانہ اور دانشورانہ تعبیر نہیں بلکہ علماءِ کرام کے مصدقہ تصوّرات پر مبنی ہو اور نری جامد مذہبیت نہیں بلکہ ایک متحرک انقلابیت کی صورت اختیار کرے!!!

اور یہ چیز خود اسلام کے اعتبار سے بھی 'تجدّد' نہیں بلکہ صرف 'تجدید' کا مظہر ہوگی اور پاکستان کے نقطۂ نگاہ سے بھی کسی نئی منزل کی جانب رُخ موڑنے کی نہیں بلکہ ع "کبھی بھولی ہوئی منزل بھی یاد آتی ہے راہی کو!" کے مصداق اپنے تاسیسی نظریہ و مقصد کی جانب رجوع کے مترادف ہوگی! (انشاء اللہ)

حضرت مولینا مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ

اپنی تالیف **وحدتِ اُمّت** ہیں اگر

○ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ اور مولانا سیّد انور شاہ کاشمیریؒ کے دو ایمان افروز اور سبق آموز واقعات کے سوا اور کچھ نہ لکھتے تب بھی یہ کتاب موتیوں میں تُلنے کی مستحق ہوتی وقت کے اہم ترین موضوع پر اِس بہترین اور مفید ترین کتاب کو اب مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور نے شایانِ شان طور پر شائع کیا ہے۔

بڑے سائز کے ۵۲ صفحات ○ عمدہ دبیز کاغذ ○ دیدہ زیب کور

ہدیہ: ۴ روپے ○ علاوہ محصول ڈاک

باب پنجم

موجودہ مُسلمان معاشرہ کا اِسلام کے ساتھ عملی تعلّق

گذشتہ مباحث سے یہ حقیقت بالکل دو اور دو چار کی طرح واضح ہوگئی ہے کہ: (۱) پاکستان کی اصل اساس صرف اور صرف اسلام ہے۔

(۲) اِس کا دوام و استحکام صرف ایک ایسے جاندار مذہبی جذبے کے ذریعہ ممکن ہے جو عوامی سطح پر اسلام کے ساتھ حقیقی و عملی تعلق کی بنیاد پر اُبھرے اور ایک انقلابی تحریک کی صورت اختیار کرلے!

تو آیئے اب ذرا اِس امر کا جائزہ لیں کہ مجموعی اعتبار سے ہمارے موجودہ معاشرے کے اسلام کے ساتھ حقیقی لگاؤ اور عملی تعلق کا کیا حال ہے؟ اور ہماری قومی اور ملّی وجود کی اِس واحد اساس کے ساتھ ہمارا بالفعل تعلق کس درجہ کا ہے؟!

ایک ضروری وضاحت

اِس مرحلہ پر ایک اہم وضاحت بہت ضروری ہے — ہمارے سابقہ مباحث سے بھی کچھ لوگوں نے لازماً مایوسی اور بددلی کا تاثر قبول کیا ہوگا اور اس کا اندیشہ ہے کہ پیشِ نظر جائزے اور تجزیئے سے اِس کیفیت میں مزید شدت پیدا ہوجائے، لہٰذا مناسب ہے کہ یہاں یہ ذکر کردیا جائے کہ جس تصویر کا تاریک رُخ مسلسل سامنے آرہا ہے اُس کا ایک نہایت روشن اور تابناک رُخ بھی ہے جو اِن شاء اللہ ذرا اور آگے چل کر سامنے آئے گا — سرِدست جس ترتیب

سے بحث آگے بڑھ رہی ہے اُس کا تقاضہ ہے کہ ہم ناخوشگوار حقائق کو اُن کی واقعی صورت میں دیکھنے کی ہمت کو برقرار رکھتے ہوئے اپنے مشاہدے اور جائزے تجزیئے کو امکانی حد تک زیادہ سے زیادہ معروضی (OBJECTIVELY) رکھیں۔ تاکہ ہمارے سامنے مسئلہ کی نزاکت اور صورتِ حال کی سنگینی پوری طرح واضح ہو اور ہم اُس کے تدارک کے ضمن میں نہ سطحی انداز اختیار کریں نہ محض دفع الوقتی کی تدابیر میں اُلجھ کر رہ جائیں بلکہ پوری سنجیدگی کے ساتھ غور و فکر کی جملہ صلاحیتوں کو بروئے کار لائیں اور فیصلہ کُن انداز میں بھرپور اقدامات کا فیصلہ کر سکیں۔

پندرہ سال قبل اور آج

اتفاق کی بات ہے کہ راقم اپنے پیشِ نظر سلسلۂ مضامین کے ضمن میں جب اُس مقام پر پہنچا تو اچانک ذہن منتقل ہُوا کہ اِسی موضوع پر راقم نے آج سے لگ بھگ پندرہ سال قبل پاکستان میڈیکل ایسوسی ایشن کی لاہور برانچ کی ایک تقریب میں تقریر کے دوران اپنا جائزہ اور تجزیہ ایک تمثیل کے پیرائے میں پیش کیا تھا۔ ساتھ ہی یہ بھی یاد آیا کہ تقریر کا وہ حصّہ ماہنامہ میثاق لاہور میں شائع بھی ہو گیا تھا۔ اِس موقعے پر اُس پر نظر ڈالنے سے ایک تو یہ احساس ہُوا کہ اِس تمثیل کے ذریعے ہمارے معاشرے کی اسلام کے ساتھ عملی تعلق کی نہایت صحیح تصویر پوری وضاحت کے ساتھ ہمارے سامنے آجاتی ہے اور دوسرے یہ حیرتناک اور افسوسناک انکشاف بھی ہُوا کہ اِس کے باوجود کہ ہمارے معاشرہ میں متعدد دینی جماعتیں اور تحریکیں اپنے اپنے انداز میں کام کر رہی ہیں اور ہماری آبادی کے طبقۂ متوسط (MIDDLE CLASS) کا خاصا قابلِ لحاظ حصّہ ان کے زیرِ اثر آیا ہے تاہم پندرہ سال سے زیادہ عرصہ گذر جانے کے باوجود بحیثیتِ مجموعی ہمارے موجودہ مسلمان معاشرہ کے اسلام کے ساتھ عملی تعلق میں نہ کوئی نوعیت و کیفیت کے اعتبار سے (QUALITATIVELY) کوئی تبدیلی واقع

ہوئی ہے نہ ہی تناسب اور کمیت کے اعتبار سے (QUANTITATIVELY) کوئی فرق پیدا ہُوا ہے۔ اِس لیے کہ جہاں ہماری قوم کے درمیانی طبقے میں مختلف ذہنی و مذہبی تحریکوں کے زیرِ اثر دین و مذہب کے ساتھ عملی لگاؤ کے تناسب میں کسی قدر اضافہ ہُوا ہے وہاں عوام کے طبقۂ زیریں (LOWER CLASS) میں اُس کیفیت کے بالکل برعکس جو علامہ اقبال نے اب سے پون صدی قبل اِس شعر میں بیان کی تھی کہ ؎

"آ کے ہوتے ہیں مساجد میں صف آرا تو غریب
پردہ رکھتے ہیں اگر کوئی تمہارا تو غریب!"

نہ صرف یہ کہ دین و مذہب کے ساتھ عملی لگاؤ میں نمایاں کمی واقع ہوئی ہے، بلکہ لادینی طرزِ فکر (SECULAR THINKING) اور مادہ پرستانہ اقدار (MATERIALISTIC VALUES) کا تناسب بہت بڑھ گیا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ملحدانہ افکار و نظریات اور مادہ پرستانہ طرزِ عمل کے اثرات جو پہلے صرف اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقات (EDUCATED ELITE) تک محدود تھے، گذشتہ پندرہ سالوں میں اوّلاً ٹرانسسٹر اور بعد ازاں ٹیلی ویژن ایسے مؤثر اور طاقت ور ذرائع ابلاغ (MEDIA) کے ذریعے ہمارے معاشرہ کی سب سے تحتانی سطح یعنی ——— (GRASS ROOT LEVEL) تک پہنچ گئے ہیں جن سے نہ صرف یہ کہ طبقۂ متوسط میں دین و مذہب کا اثر و نفوذ غیر مؤثر (NEUTRALISE) ہو گیا ہے — بلکہ نسبت و تناسب کے پلڑے کا جُھکاؤ مزید فیصلہ کُن انداز میں لادینیت کی جانب ہو گیا ہے — واللہ اعلم!!

چار ہم مرکز دائرے

بہر حال، راقم کے مشاہدے کے مطابق دین و مذہب کے ساتھ حقیقی اور واقعی لگاؤ اور عملی تعلق کے اعتبار سے پاکستان کا موجودہ مسلمان معاشرہ چار ایسے

ہم مرکز دائروں (CONCENTRIC CIRCLES) پر مشتمل ہے جو ایک دوسرے سے نمایاں طور پر متمائز (DISTINCT) ہیں۔ چنانچہ ایک نہایت چھوٹا سا دائرہ مرکز سے بالکل متصل ہے جس میں میرے اندازے کے مطابق ہماری کُل آبادی کا بمشکل ایک فی صد بلکہ اس سے بھی بہت کم شامل ہے۔ اِس کے باہر ایک ذرا بڑا دائرہ ہے جس میں کُل آبادی کے دو یا زیادہ سے زیادہ تین فی صد لوگ شمار کیے جاسکتے ہیں۔ پھر ایک اور بڑا دائرہ ہے جس میں لگ بھگ پانچ چھ فی صد لوگ شامل ہوں گے۔ اور پھر ایک بہت بڑا دائرہ ہے جو بقیہ نوّے بانوے فی صد آبادی پر مشتمل ہے۔

ہماری ایک عظیم اکثریت کا دین و مذہب کے ساتھ کوئی عملی تعلّق نہیں ہے

ان میں سب سے بڑا دائرہ جس کی خارجی حدود پورے معاشرے کو محیط ہیں، اُن لوگوں پر مشتمل ہے جن کا دین و مذہب کے ساتھ سرے سے کوئی عملی تعلّق باقی نہیں رہا۔ ماسوائے اُن چند ناگزیر تمدّنی اور سماجی اُمور کے جن میں دین و مذہب کے خلاف کسی روش کا اختیار کرنا مذہب سے علی الاعلان قطع تعلّق کے بغیر ممکن نہیں ہوتا۔ یعنی شادی بیاہ کا معاملہ، میّت کی تکفین و تدفین سے متعلّق رسومات اور کچھ مذہبی تہوار وغیرہ۔

اِس سلسلے میں، مَیں جب زور دے کر کہتا ہوں کہ ہماری عظیم اکثریت کا مذہب کے ساتھ سرے سے کوئی تعلّق نہیں ہے تو اُس سے میرے احساس کی شدّت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے اور مَیں ہر شخص کو دعوت دیتا ہوں کہ وہ دین و مذہب کے ساتھ عملی تعلّق کا جو بھی معیار (CRITERION) متعیّن کرلے، جب وہ اِس پر اپنے موجودہ معاشرے کو پرکھے گا تو اِس کے سامنے

بعینہٖ وہی نتیجہ آئے گا جو اوپر بیان ہو چکا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہماری اکثریت کا اس کے سوا کہ جب اِن کے یہاں شادی ہوتی ہے تو پھیرے نہیں پڑتے بلکہ کوئی مولوی صاحب نکاح ہی کی رسم ادا کرتے ہیں۔ یا کوئی مَر جاتا ہے تو اُسے جلایا نہیں جاتا بہر حال نمازِ جنازہ ہی ادا کی جاتی ہے اور تکفین و تدفین ہی کا معاملہ ہوتا ہے — یا یہ کہ ہولی یا دیوالی یا کرسمس نہیں منائے جاتے، عید و بقر عید ہی کے تہوار منائے جاتے ہیں، دین و مذہب کے ساتھ کوئی اور عملی تعلق موجود نہیں ہے — اسلام کے اوامر و نواہی کی مفصّل فہرست اور حلال و حرام کا تفصیلی خاکہ تو دُور کی بات ہے، نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے نماز پنجگانہ کو کفر اور اسلام کے مابین حدِّ فاصل قرار دیا ہے، خواہ اِس معیار کو سامنے رکھ لیا جائے یا اِس سے بھی آگے بڑھ کر بلا عذرِ شرعی مسلسل تین جمعوں کی غیر حاضری پر توصاف وعید سنا دی گئی ہے کہ اللہ کو ایسے شخص کے بارے میں کوئی پرواہ نہیں ہے کہ وہ نصرانی ہو کر مرے یا یہودی ہو کر، تو خواہ اِس پیمانے سے ناپ لیا جائے۔ بہر حال آپ جس پیمانے سے بھی ناپیں گے نتیجہ ایک ہی نکلے گا اور وہ یہ کہ ہماری قوم کی ایک عظیم اکثریت کا دین و مذہب سے کوئی واقعی اور عملی تعلق موجود نہیں ہے۔

پھر ایسا نہیں ہے کہ یہ صورتِ حال معاشرے کے کسی خاص طبقہ کی ہو — ایک عام مغالطہ پیدا ہو گیا ہے یا پیدا کر دیا گیا ہے کہ یہ معاملہ صرف امراء یا اعلیٰ طبقہ کا ہے، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ حال ہماری پوری سوسائٹی کا بحیثیتِ مجموعی ہے۔ چنانچہ امراء کی اکثریت بھی اسی حال میں ہے اور غرباء کی بھی۔ کارخانہ داروں کی اکثریت کا حال بھی یہی ہے اور مزدوروں کا بھی۔ زمینداروں کی اکثریت بھی دین سے اتنی ہی دُور ہے اور کاشتکاروں کی بھی۔ گلبرگ اور کلفٹن کے باسی بھی اکثر و بیشتر اسی حال میں ہیں اور جھونپڑیوں کے مکین بھی — الغرض ہماری پوری سوسائٹی کا چاہے جس زاویہ سے (CROSS SECTION) لے لیا جائے، صورتِ معاملہ واحد ہے۔ صرف اسی ایک فرق کے ساتھ کہ امراء اور اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقات کے ایک معتد بہ اور غالب حصّے

میں اِس عملی روش کی پُشت پر ایک فکری الحاد اور ذہنی ارتداد بھی موجود ہے۔ جبکہ عوام النّاس کے اذہان میں کوئی واضح چیز موجود نہیں۔ وہ صرف ایک رَو میں بہے چلے جا رہے ہیں جو اکثر و بیشتر انہی اعلیٰ طبقات کے زیرِ اثر چل رہی ہے ـــــ الغرض یہ ہے ہماری قوم کی غالب اکثریت کا حال!

مذہب کے متوسّلین کی اکثریت کا تصوّرِ دین محدُود بھی ہے اور مسخ شدہ بھی!

اِس بڑے دائرے کے اندر ایک نسبتاً چھوٹا دائرہ ہے جو ایسے لوگوں پر مشتمل ہے جو دین و مذہب سے عملی دلچسپی لیتے ہیں۔ چنانچہ انہی کے دم سے مساجد تعمیر ہوتی ہیں اور آباد رہتی ہیں۔ مدارس و مکاتب اور دارالعلوم قائم ہوتے ہیں، اور جاری رہتے ہیں۔ جمعہ و جماعت کا نظام قائم ہے۔ ماہِ صیام کی رونق اور گہما گہمی ہے۔ حج اور عمرہ کے لیے آمد و رفت کا سلسلہ جاری ہے ـــــ الغرض مذہب کا پورا ڈھانچہ قائم ہے ـــــ

لیکن ذرا بنظرِ غائر جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اِس طبقے کی ایک عظیم اکثریت کا تصوّرِ دین نہ صرف یہ کہ نہایت محدود (LIMITED) ہے بلکہ اکثر و بیشتر حالتوں میں سخت مسخ شدہ (PERVERTED) بھی ہے۔ چنانچہ اُن کے نزدیک مذہب صرف بعض علامات (SYMBOLS) اور رسومات (RITUALS) کا مجموعہ بن کر رہ گیا ہے اور اُس کا کوئی تعلق نہ انسان کی انفرادی سیرت و کردار سے رہ گیا ہے نہ قومی و ملّی امور اور اجتماعی معاملات سے۔ نتیجتہً وہ دین جو اپنی اصل فطرت کے اعتبار سے پوری انسانی زندگی پر حکمرانی چاہتا ہے اُن کے یہاں زندگی کے بہت ہی چھوٹے سے گوشے میں محدود ہو کر رہ گیا ہے اور اس کے وسیع تر تقاضوں کا اِنہیں سرے سے کوئی احساس ہی نہیں رہا۔

یہی وجہ ہے کہ اِس حلقے کی ایک غالب اکثریت کا حال یہ ہے کہ دینداری کے جملہ مظاہر یعنی نماز، زکوٰۃ، روزہ اور حج حتّٰی کہ پوری شرعی وضع قطع کے ساتھ ساتھ بلیک مارکیٹنگ بھی چلتی ہے اور ذخیرہ اندوزی بھی، اسمگلنگ بھی جاری رہتی ہے اور کرنسی کا غیر قانونی لین دین بھی — اشیاءِ خورد و نوش ہی نہیں ادویات تک ان کے ہاتھوں ملاوٹ ایسے حد درجہ مکروہ حرکت سے محفوظ نہیں رہتیں — انکم ٹیکس اور کسٹم یا ڈیوٹی کی چوری کو مباح کا مقام دینے میں انہیں ذرا باک نہیں۔ رشوت دی بھی جاتی ہے اور لی بھی — سودی رقوم سے کاروبار کو وسیع تر کرنا اور مکان تعمیر کرنا تو شیرِ مادر ہے ہی، جہاں موقع ملے سٹّے وغیرہ سے بھی اجتناب نہیں — ان سب پر مستزاد یہ کہ الّا ماشاء اللہ اِس حلقے کی اکثریت ذاتی اخلاق اور بین الانسانی معاملات کے دائرے میں بالعموم بہت پستی کردار کا مظاہرہ کرتی ہے خشونت، درشتی اور سنگ دِلی ان طبیعتِ ثانیہ بن گئے ہیں اور ہمدردی اور دل کی نرمی سے انہیں دُور کا بھی واسطہ نہیں الّا ماشاء اللہ۔ اِن تمام باتوں کا مجموعی نتیجہ یہ ہے کہ ہماری نوجوان نسل اِن لوگوں سے متنفّر ہو کر سرے سے دین و مذہب ہی سے بدظن ہوتی چلی جا رہی ہے۔

تصوّرِ مذہب کی اِسی محدودیت کا ایک نتیجہ یہ نکلا ہے کہ مذہب کے نام پر نت نئی رسومات ایجاد ہو رہی ہیں اور بدعات و رسومات کا بازار ہے کہ گرم سے گرم تر ہوتا چلا جا رہا ہے اور اسلام جو انتہائی سادہ دینِ فطرت ہے، روز بروز اوہام کے پلندے اور بدعات و رسومات کے طومار کی شکل اختیار کرتا چلا جا رہا ہے — اِس کی وجہ بالکل واضح ہے۔ یعنی یہ کہ وہ دینی و مذہبی جذبہ جسے انسان کی پوری زندگی میں سرایت کر جانا چاہیئے تھا، جب سمٹ کر صرف ایک گوشے میں مقیّد ہو گیا اور اُسے اپنی تسکین صرف اِسی چھوٹے سے گوشہ ہی سے حاصل کرنی پڑی تو اس نے زور لگا کر اسی گوشہ میں غیر متناسب (OUT OF PROPORTION) بڑھنا شروع کر دیا۔ چنانچہ مثال کے طور پر ایک طرف میّت کی رسومات کا سلسلہ

ہے کہ ربڑ کی طرح کھنچتا چلا جا رہا ہے اور دوسری طرف تہواروں کا معاملہ ہے، کہ ان کی فہرست بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ وقس علیٰ ہٰذا۔!

مختصر یہ کہ دین و مذہب سے دلچسپی رکھنے والے لوگوں کی ایک غالب اکثریت کا تصورِ مذہب نہایت محدود بھی ہے اور مسخ شدہ بھی!

وسیع تر تصوّر کے حامل لوگوں کی اکثریت خود کچھ کرنے کو تیار نہیں!!

اِس دوسرے دائرے کے اندر ایک تیسرا چھوٹا دائرہ ہے جو اُن لوگوں پر مشتمل ہے جن کا تصورِ دین و مذہب خاصا وسیع ہے اور وہ جانتے ہیں کہ اسلام صرف چند عقائد اور رسومات کا مجموعہ نہیں بلکہ اس کی بنیاد کائنات، انسان اور حیاتِ انسانی کے بارے میں ایک خاص نقطۂ نظر پر قائم ہے اور وہ انسان کی پوری زندگی کو اپنے احاطہ میں لینا چاہتا ہے اور حیاتِ انسانی کے تمام گوشوں پر تسلط اور حکمرانی کا طالب ہے۔ برِصغیر میں یہ فکر ماضی قریب میں اوّلاً علامہ اقبال مرحوم کے، اشعار سے پروان چڑھا اور ان کے بعد مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی اور بعض دوسرے اصحابِ علم کی تحریروں نے اِسے مزید واضح بھی کیا اور زیادہ بڑے حلقہ میں عام بھی کیا۔ چنانچہ اب یہ ایک واقعہ ہے کہ برِصغیر کے مسلمانوں کی موجودہ نسل کا ایک خاصا قابلِ ذکر حصّہ اِس فکر سے متاثر ہے اور اُس کے دل میں احیائے اسلام کی آرزو اور اقامتِ دین کی تمنا بھی موجود ہے — اور اسلام کی عظمتِ گذشتہ اور مسلمانوں کی سطوتِ پارینہ کی بازیافت کی خواہش بھی — لیکن یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ اِس طبقہ کی ایک بڑی اکثریت محض حسین تمناؤں اور عمدہ آرزوؤں کے سہارے جی رہی ہے، خود کچھ کرنے کو تیار نہیں۔ اِن کی خواہش غالباً یہ ہے کہ یہ سارے کام کوئی اور کر دے

اور وہ خود اپنی اپنی دلچسپیوں اور پیشہ ورانہ مصروفیتوں میں مگن رہیں، خود انہیں نہ کوئی ایثار کرنا پڑے نہ قربانی دینی پڑے، نہ کوئی تکلیف برداشت کرنی ہو اور نہ کسی محنت و مشقّت کا سامنا ہو۔ وہ بہت زور لگائیں گے تو کسی جماعت کے لیے تائید و تحسین کے چند جُملے زبان سے ادا کردیں گے یا اُسے کوئی مالی امداد بہم پہنچا دیں گے اور وہ بھی اپنی آمدنیوں کے اعتبار سے آٹے میں نمک کے برابر۔ اللہ اللہ خیر سلّا ـــ اِس سے آگے بڑھ کر نہ اُن کی زندگیوں کا رُخ تبدیل ہوگا نہ دلچسپیوں میں کمی آئے گی اور نہ ہی شب و روز کے مشاغل میں کوئی فرق واقع ہوگا ـــ

الغرض ـــ یہ ہے میرے تجزیہ کے مطابق ہماری موجودہ سوسائٹی کا دائرہ ثالث جو دین و مذہب کے لیے زبانی جمع خرچ (LIP SERVICE) میں تو بہت آگے ہے لیکن اِس کے لیے کسی عملی جدّ و جہد میں شرکت کے لیے قطعاً آمادہ نہیں۔ حالانکہ میرے نزدیک اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کا کٹھن مرحلہ اگر سر ہوسکتا ہے تو اِسی حلقہ کی محنت و مشقّت اور ایثار و قربانی سے ـــ اور اگر اِس طبقہ کو آمادۂ عمل (ACTIVATE) نہ کیا جاسکا تو میرے نزدیک اِس منزل کی طرف قدم اُٹھنا بہت مشکل ہے۔ اِس لیے کہ اگرچہ یہ دائرہ پہلے دونوں دائروں سے تو بہت چھوٹا ہے لیکن ہے نہایت اہم ـــ!

فعّال دینی جماعتیں اور جمعیتیں

اِن تینوں دائروں کے اندر ایک نہایت چھوٹا سا دائرہ ہے جسے ہم مذہب کے لیے سرگرم کارلوگوں (RELIGIOUS ACTIVISTS) کا حلقہ کہہ سکتے ہیں جس میں ہماری کُل آبادی کی بمشکل ایک فی صد بلکہ اُس سے بھی بہت کم تعداد شامل ہے۔ یہ حلقہ بہت سی خالص مذہبی یا نیم دینی و نیم سیاسی جماعتوں پر مشتمل ہے۔ جن کی جڑیں دوسرے اور تیسرے دائروں میں دُور دُور تک پھیلی ہوئی ہیں جن سے انہیں اخلاقی تائید اور مالی تعاون کی صورت میں غذائیت حاصل

ہوتی رہتی ہے — اِن میں سے دو تو "جماعتیں" ہیں اور کم و بیش نصف درجن "جمعیتیں" — جماعتوں میں سے ایک تبلیغی جماعت ہے جو خالص مذہبی اور بالکل غیر سیاسی خطوط پر کام کر رہی ہے اور دوسری جماعتِ اسلامی ہے جو اس کے برعکس سیاست کے میدان میں بہت آگے نکل گئی ہے اور اس خارزار میں کچھ زیادہ اُلجھ کر رہ گئی ہے۔ اِس بُعد المشرقین کے ساتھ ساتھ ان میں دو باتیں مشترک بھی ہیں۔ ایک یہ کہ اِن دونوں ہی کی تاریخ تقریباً نصف صدی پر پھیلی ہوئی ہے۔ اور دوسرے یہ کہ اِن دونوں کو اصل تائید و تقویت دائرہ ثالث سے مِل رہی ہے اور اِن کی جڑیں زیادہ تر اسی حلقہ میں قائم ہیں — ان کے بالمقابل اہلحدیث، دیوبندی اور بریلوی علماء پر مشتمل "جمعیتیں" ہیں جن کی مزید تقسیم اور تسمیے کا سلسلہ کچھ ایسا پیچ در پیچ ہے کہ عام آدمی کی سمجھ میں آنے والا نہیں، بہرحال ان میں بھی دو امور مشترک ہیں۔ ایک یہ کہ ان میں سے تقریباً ہر ایک اپنی پشت پر لگ بھگ پوری صدی کی تاریخ رکھتی ہے اور دوسرے یہ کہ ان کی اصل جڑیں دائرہ دوم میں قائم ہیں اور وہیں سے ان کے تغذیہ و تقویت کا سامان فراہم ہوتا ہے۔

مذہب کی نام لیوا، بلکہ علمبردار جماعتوں اور جمعیتوں کے بارے میں سب سے زیادہ نمایاں المیہ ان کا باہمی اختلاف بلکہ مخالفت ہے جو حد درجہ مکروہ الزام تراشی بلکہ دشنام طرازی کی حد تک پہنچ جاتی ہے — اور اگرچہ یہ بھی حقیقت ہے کہ ہمارے معاشرے میں اب ان سب کے مجموعی اثرات بھی کچھ بہت زیادہ نہیں ہیں تاہم جس مایوس کن شکست کا سامنا مذہب کے نام لیواؤں کو ملک کے عام انتخابات میں کرنا پڑتا ہے، واقعہ یہ ہے کہ اس میں بہت حد تک دخل اس باہمی تفرقہ بازی اور سر پھٹول کو حاصل ہے۔ چنانچہ ہمارے معاشرے کے اُن طبقات کو جو دین و مذہب کے متقبل سے کسی قدر دلچسپی رکھتے ہیں، اِس صورتِ حال سے فی الواقع بہت صدمہ پہنچتا ہے، جس کی ٹیسیں اکثر لوگوں کو شدت کے ساتھ محسوس ہوتی رہتی ہیں اور ہمارے یہاں ایسے لوگوں کی کمی نہیں جن کے دلوں میں یہ حسرت بھری تمنا موجود ہے کہ کسی طرح مختلف فرقوں اور گروہوں کے علماء و زعماء اور مختلف مذہبی جماعتیں متحد ہو کر کسی ایک

پلیٹ فارم پر جمع ہو جائیں یا کم از کم یہ جماعتیں اور جمعیتیں اپنے اپنے طریقہ ہائے کار میں اعتدال کی روش اختیار کر لیں۔ چنانچہ اس ذیل میں بہت سے لوگ انہیں مخلصانہ مشوروں سے نوازتے بھی رہتے ہیں۔

میری حقیر رائے میں ان نیک تمناؤں کا بر آنا آسان نہیں ہے۔ اس لیے کہ نہ یہ جماعتیں اور جمعیتیں کوئی آج قائم ہوئی ہیں اور نہ ہی ان کے طریقہ ہائے کار اتنے 'حادث' ہیں بلکہ جیسا کہ اس سے قبل عرض کیا جا چکا ہے کہ ان کی پشت پر پوری پوری صدی یا کم از کم نصف صدی کی تاریخ ہے اور اس طویل عرصہ کے دوران میں ان کے مخصوص نقطہ ہائے نظر، طریق ہائے کار اور مزاج و افتادِ طبع پختہ ہوتے چلے گئے ہیں — اور اب ان میں کسر و انکسار اور ترمیم و تغیر ناممکن نہ سہی نہایت مشکل ضرور ہے! تاہم ملک و ملت کے خیر خواہوں کو اس کے ضمن میں پوری ہمت و عزیمت کو بروئے کار لانا چاہیئے۔ اس لیے کہ کسی بھی مؤثر اور نتیجہ خیز تعمیری کوشش کے آغاز کے لیے اس کٹھن منزل کا سر کرنا ناگزیر ہے!!

حاصلِ کلام : عقدۂ لاینحل؟

اب تک کی کُل بحث کے نتیجے میں ہم بظاہر ایک نہایت شدید قسم کی منطقی پیچیدگی یا عقدۂ لاینحل (DILEMMA) سے دوچار ہو گئے ہیں۔ یعنی ہمارے تجزیہ کے مطابق ایک جانب پاکستان ایک ایسا ملک ہے جس کی واحد اساس اسلام ہے اور اس کے بقاء و استحکام کا واحد ذریعہ صرف ایک ایسا زوردار اور متحرک مذہبی جذبہ بن سکتا ہے جس کی جڑیں عوامی سطح پر اسلام کے ساتھ واقعی اور عملی تعلق میں گہری اتری ہوئی ہوں اور دوسری جانب بحیثیت مجموعی پاکستان کے موجودہ مسلم معاشرے کا دین و مذہب کے ساتھ حقیقی و عملی تعلق نہ ہونے کے برابر ہے! — اس پر فطری طور پر یہ سوال سامنے آتا ہے کہ: ع " چیست یارانِ طریقت بعد ازیں تدبیرِ ما؟ "

لیکن اس سے قبل کہ ہم اُس عملی تدبیر پر غور کریں، ہمارے قومی و ملی وجود کی تصویر کا دوسرا رُخ جو نہایت روشن اور تابناک ہے سامنے آجانا چاہیئے۔ لہٰذا آئندہ اسی موضوع پر گفتگو ہوگی۔ ——— (جاری ہے)

اسلامی انقلاب: مراحل، مدارج اور لوازم (خطاب ۶)

مسلح تصادم: غزوہ بدر سے صلح حدیبیہ تک (۲)

امیر تنظیم اسلامی، ڈاکٹر اسرار احمد، کا سلسلہ وار خطاب

(سلسلے کے لیے جنوری ۱۹۸۶ء کا شمارہ ملاحظہ فرمائیں)

نبی اکرمؐ کی جنگی حکمت عملی

اُحد میں قریش کی جو فوج آئی تھی تو ان کے ساتھ دو سو گھڑ سواروں کا دستہ تھا اور ان پر سپہ سالار کون ہیں! خالد ابن ولید ابن مغیرہ ـــــ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اُحد پہاڑ کو اپنی پشت پر رکھا اس کے دامن میں صفیں بنوائیں۔ سامنے مشرکین ہیں۔ جبل احد کے ساتھ ایک درّہ ایسا تھا کہ اُحد کے پیچھے سے چکر لگا کر اس درّہ سے گزر کر مسلمانوں کے لشکر پر حملہ ہو سکتا تھا۔ نبی اکرمؐ نے اسی اندیشہ کے پیش نظر کہ کہیں ادھر سے حملہ نہ ہو جائے اور کہیں ہماری پیٹھ میں خنجر گھونپے جانے والا معاملہ نہ ہو جائے۔ پچاس تیر اندازوں کو اس درّہ پر حضرت عبداللہ ابن جبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی سرکردگی میں تعینات فرمایا۔ حضورؐ نے نہایت تاکیدی اسلوب سے فرمایا کہ "تم لوگوں کو یہاں سے نہیں ہلنا۔ اگر ہم سب ہلاک ہو جائیں اور تم یہ دیکھو کہ ہماری بوٹیاں نوچ نوچ کر پرندے کھا رہے ہیں تب بھی تم لوگ یہاں سے نہ ہٹنا"۔ آپؐ اس تاکید کا، اس زور کا، اس شدت کا، اس emphasis کا اندازہ کیجیے جو اس حکم میں نظر آتا ہے۔

ایک خوفناک غلطی

بہرحال جنگ ہوئی اور جیسا کہ میں نے عرض کیا۔ پہلے ہلّے میں مشرکین کے قدم اکھڑے اور مسلمانوں نے پیچھا شروع کیا۔ چند کفار کا تعاقب کر رہے تھے اور چند مالِ غنیمت سمیٹنے میں لگ گئے تھے۔ ادھر جو صحابہ کرامؓ درہ پر تعینات تھے، ان میں اختلاف رائے ہو گیا۔ ان پچاس تیر اندازوں میں سے اکثر نے کہا کہ چلو ہم بھی چلیں، مالِ غنیمت جمع کریں۔ اب تو فتح ہو گئی ہے۔ ان کے کمانڈر حضرت عبداللہ ابن جبیرؓ نے فرمایا "ہرگز نہیں حضورؐ نے فرمایا تھا کہ یہاں سے نہ ہلنا۔ میں کسی کو اجازت نہیں دیتا"۔ لیکن ہوا یہ کہ اکثر نے اپنے کمانڈر کی بات نہ مانی اور اس درّے کو چھوڑ کر مالِ غنیمت کے حصول میں مصروف ہو گئے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اسی غلطی کے باعث فتح شکست میں بدل گئی۔ تفصیل سے بعد میں عرض کروں گا۔ یہاں فی الحال یہ سمجھئے کہ اس غلطی کی نوعیت کیا تھی!

___ میری رائے ہے کہ ان حضرات نے جو درّے کو چھوڑ گئے اپنے نزدیک یہ تاویل کی ہوگی کہ حضورؐ نے تو شکست کی صورت میں اتنا زور دیا تھا کہ چاہے ہم سب ہلاک ہو جائیں اور تم دیکھو کہ پرندے ہماری بوٹیاں نوچ کر کھا رہے ہیں تب بھی تم یہاں سے مت ہٹنا۔ اب تو فتح ہوگئی ہے۔ لہٰذا اب یہاں سے ہلنے میں کیا ہرج ہے۔! میں یہ تعبیر اس لئے کر رہا ہوں کہ ان میں منافق کوئی نہیں تھا، سب کے سب مومنین صادقین تھے۔ اچھی طرح سمجھ لیجئے، غلطی خلوص سے بھی ہو جاتی ہے، نیک نیتی سے بھی ہو جاتی ہے۔ لہٰذا میری تعبیر یہ ہے کہ ان سے تاویل سے میں غلطی ہوئی ہوگی۔

نظم کی اہمیت

لیکن یہاں نوٹ کیجئے کہ اصل بات کیا تھی! وہ یہ تھی کہ جو اس دستہ کا امیر ہے وہ تو اجازت نہیں دے رہا۔ چلئے انہوں نے نبی اکرمؐ کے حکم کی تاویل کرلی۔ لیکن یہاں ان کے اور حضورؐ کے مابین ایک لوکل کمانڈر موجود ہے۔ جس کو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے امیر مقرر فرمایا ہے ___ اس امیر کی تو نافرمانی ہوگئی کہ نہیں ہوگئی! اس کے حکم کی خلاف ورزی ہوگئی کہ نہیں! ڈسپلن (Discipline) تو بہر حال ٹوٹ گیا! وہ بیعت عقبہ ثانی کے الفاظ یاد کیجئے جو حضرت عبادہ ابن الصامت رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہیں جو بارہا میں نے آپ کو سنائے ہیں اور ان کے متعلق عرض کیا ہے کہ اس ایک حدیث کے اندر پورا نظام جماعت موجود ہے۔ اور حدیث بھی کس پائے کی ہے اس کا اندازہ اس سے لگا لیجئے کہ اس کو امام بخاری اور امام مسلم رحمہما اللہ اپنی صحیح میں لائے ہیں۔ سند کے اعتبار سے حدیث کے صحیح ہونے کا اس سے اونچا کوئی مقام نہیں ہے۔

حدیث ایک بار پھر سن لیجئے!

عَنْ عِبَادَةَ ابْنِ الصَّامِتِؓ قَالَ بَايَعْنَا رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ
عَلَی السَّمْعِ وَالطَّاعَۃِ فِی الْعُسْرِ وَالْیُسْرِ وَالْمَنْشَطِ وَالْمَکْرَہِ وَعَلٰی اَثَرَۃٍ
عَلَیْنَا وَعَلٰی اَنْ لَّا نُنَازِعَ الْاَمْرَ اَھْلَہٗ وَعَلٰی اَنْ نَقُوْلَ بِالْحَقِّ اَیْنَمَا کُنَّا
لَا نَخَافُ فِی اللّٰہِ لَوْمَۃَ لَائِمٍ۔

"حضرت عبادہ ابن صامت سے روایت ہے وہ کہتے ہیں کہ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کی تھی کہ ہم حکم سنیں گے اور مانیں گے خواہ مشکل ہو خواہ آسان، خواہ ہماری طبیعت کو خوش گوار لگے خواہ ناگوار ہو، خواہ دوسروں کو ہم پر ترجیح دی جائے اور جس کو بھی ہم پر امیر بنا دیا جائے گا ہم اس سے جھگڑیں گے نہیں اور ہم حق کہتے رہیں گے جہاں بھی ہوں اور اللہ کے معاملہ میں (حق کہنے سے) ہم ہرگز نہیں ڈریں گے کسی ملامت گر کی ملامت سے۔"

ظاہر بات ہے کہ ہر جگہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بنفسِ نفیس تو موجود نہیں ہو سکتے تھے۔ آپؐ کسی مہم پر کسی لشکر کو بھیجتے تھے تو اس کا ایک کمانڈر یا امیر مقرر فرما دیتے۔ اب وہ امیر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا قائم مقام ہے، اب معروف میں سمع وطاعت کے اعتبار سے اس کا حکم بالکل اسی طرح مانا جائے گا۔ جیسے نبی اکرمؐ کا حکم مانا جائے گا۔ یہی ڈسپلن ہے جس کو میں بار بار Army Discipline سے تعبیر کیا کرتا ہوں۔ اس کے لیے حضورؐ کی ہدایت موجود ہے: مَنْ اَطَاعَنِیْ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰہَ وَمَنْ عَصَانِیْ فَقَدْ عَصَی اللّٰہَ وَمَنْ اَطَاعَ اَمِیْرِیْ فَقَدْ اَطَاعَنِیْ وَمَنْ عَصٰی اَمِیْرِیْ فَقَدْ عَصَانِیْ۔ اور بعض احادیث میں اَمِیْرِیْ نہیں ہے بلکہ اَلْاَمِیْرَ ہے یعنی: مَنْ اَطَاعَ الْاَمِیْرَ فَقَدْ اَطَاعَنِیْ وَمَنْ عَصَی الْاَمِیْرَ فَقَدْ عَصَانِیْ۔ "جس نے میری اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے اللہ کی نافرمانی کی۔ جس نے میرے معیّن کردہ امیر کا کہنا مانا، اس نے میرا کہا مانا اور جس نے امیر کی نافرمانی کی اس نے میری نافرمانی کی۔"

اسلام کا نظمِ جماعت

یہ ہے اسلامی جماعت کا نظم۔ اب آپ ذرا نوٹ کیجیے کہ پچاس کی نفری میں سے نہ تو کمانڈر اپنی جگہ سے ہلا اور چودہ حضرات اور بھی تھے۔ انہوں نے اپنے کمانڈر کے حکم کے مطابق جگہ نہیں چھوڑی پینتیس۳۵ چلے گئے۔ سات سو کی نفری میں پینتیس۔ پانچ فی صد ہوئے۔ پانچ فی صد اشخاص کی یہ غلطی جس کو آپ Indiscipline کہیں گے۔ یعنی نظم کو توڑا گیا ہے۔ اس کی کتنی بڑی سزا ہے جو اللہ تعالیٰ نے دی ہے۔ اس سے نظم کی اہمیت کا اندازہ ہو گا وہ جو اقبال نے کہا ہے کہ یہ امت ناقہ بے زمام بن گئی ہے۔ سمع وطاعت کا نظام کہیں قائم نہیں ہے۔ اور جب نظام ہی نہ ہو تو امت سمع وطاعت اور نظم کی خوگر بنے تو کیسے بنے! ہر شخص انانیت کا شکار ہے، کوئی دوسرے کو امیر مان کر اس کے ہاتھ پر بیعت کرے! یہ جذبہ سرد پڑ چکا ہے۔ آج ہماری امتِ مسلمہ میں انتشار کی جو انتہا ہے ذرا اس کو سامنے رکھیے اور یہ واقعہ نوٹ کیجیے۔ کیا معاذ اللہ حضورؐ کی کوئی غلطی تھی! اس واقعہ میں آپؐ کی تو کوئی خطا نہیں تھی۔ صرف پینتیس۳۵ صحابہ کرامؓ نے ایک غلط تاویل کر لی تھی لیکن اپنے کمانڈر کا حکم نہ ماننے کی وجہ سے یقیناً ڈسپلن توڑ دیا تھا۔ نظم کی خلاف ورزی کی تھی۔ اور موجود الوقت امیر کی نافرمانی کی تھی ___ اس کی سزا کیا ملی! یہ کہ خالد بن ولید جو اس وقت تک ایمان نہیں لائے تھے ان کی عقابی نگاہ نے تاڑ لیا کہ وہ درّہ خالی ہے۔ اصل جنگ تو ہوتی تھی پیدل فوج (Infantry) کی۔ وہ مار کھا چکی تھی۔ بھگدڑ مچ چکی تھی۔ اب انہوں نے اُحد کی پشت کا چکر کاٹا اور دو سو گھڑ سواروں کا دستہ لے کر اس درّہ سے مسلمانوں کی پیٹھ سے جو حملہ آور ہوئے تو یکلخت جنگ کا پانسہ پلٹ گیا۔

درّہ پر پندرہ تیرانداز رہ گئے تھے' ان کے لئے دو سو گھڑ سواروں کو اپنے تیروں کی بوچھاڑ سے یا تلواروں سے روکنا ممکن نہیں تھا۔ پچاس کی نفری ہوتی تو خالد ابن ولید کا اپنے دستہ کے ساتھ درّہ کو کراس کرنے کا سوال نہیں تھا۔ یہاں پندرہ کے پندرہ اصحاب رسولؐ نے جامِ شہادت نوش فرمایا۔

صورتِ حال بدل گئی

خالد بن ولید کے اس عقبی حملہ نے مسلمانوں کو سراسیمہ کر دیا۔ ان کی صفیں تو پہلے ہی درہم برہم تھیں' کچھ لوگ کفار کا پیچھا کر رہے تھے اور اکثر مالِ غنیمت اکٹھا کر رہے تھے۔ بھاگنے والے کفار نے جب خالد ابن ولید اور ان کے دستہ کے لوگوں کے نعرے سنے تو انہوں نے پلٹ کر زور دار حملہ کر دیا۔ اب مسلمان چکّی کے دو پاٹوں کے درمیان آ گئے۔ اب فتح شکست سے بدل گئی۔ سورۂ آلِ عمران کی آیت ۱۵۲ میں اس صورت حال پر تبصرہ موجود ہے۔ گھر جا کر کسی مستند تفسیر سے اس کا مطالعہ کریجئے گا۔ آیت طویل ہے' میں صرف متعلقہ آیت اور اس کی مختصر تشریح کر دیتا ہوں۔ فرمایا: وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗٓ ــــ مسلمانو! تم اللہ کو کوئی دوش نہیں دے سکتے۔ "اللہ نے تو یقیناً اپنا وعدہ پورا اور سچا کر دکھایا تھا" اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ ۔ "جب کہ تم اللہ کے حکم سے اپنے دشمنوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹ رہے تھے"۔ اللہ نے فتح دے دی تھی لیکن حَتّٰٓى اِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِى الْاَمْرِ وَعَصَيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَآ اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ ــــ "جب تم ڈھیلے پڑے"۔ یہ ڈھیلا پن وہی ہے جسے ہم کہتے ہیں کہ نظم ڈھیلا ہے۔ ایک Loose Organisation ہے۔ ماننے کو جی چاہا تو مان لیا۔ جی نہ چاہا تو نہیں مانا۔ طبیعت حاضر ہے تو آ گئے۔ اگر ذرا سا بھی کسل ہے تو نہیں پہنچ رہے۔ یہ اعصاب کا ڈھیلا پن ہے۔ یہی ضعف ارادہ ہے' فشل کا یہ مفہوم ہے ــــ اِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِى الْاَمْرِ "جب تم نے ڈھیلا پن اختیار کیا اور تم نے معاملہ میں تنازعہ کیا' جھگڑا کیا"۔ تمہارے امیر عبداللہ ابن جبیرؓ کہہ رہے تھے کہ یہاں سے مت ہلو لیکن تم نے ان سے بحث و تمحیص کی' جھگڑا کیا" وَعَصَيْتُمْ ۔ "اور تم نے نافرمانی کی"۔ یہ نافرمانی اصل میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تھی۔ چونکہ عبداللہ ابن جبیرؓ کو حضورؐ نے پچاس تیراندازوں کے دستہ پر امیر اور کمانڈر مقرر کیا تھا۔ لہٰذا نظم کے اعتبار سے کمانڈر کی نافرمانی خود حضورؐ کی نافرمانی ہو گئی۔ مِّنْۢ بَعْدِ مَآ اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ ۭ "پیچھے اس کے کہ دکھایا تم کو جو چاہتے تھے تم"۔ آیت کے اس حصّہ کی تفسیر میں اختلاف ہے۔ بعض مفسرین نے 'مَا تُحِبُّوْنَ' سے مراد مالِ غنیمت کی چاہت لی ہے اور بعض نے سورۂ صف کی آیت نمبر ۱۳ کے اس حصّہ سے کہ: وَاُخْرٰى تُحِبُّوْنَهَا ۭ نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِيْبٌ ۔ استدلال کرتے ہوئے وہ فتح مراد لی ہے جو پہلے ہلّے میں اہلِ ایمان کے لشکر کو حاصل

ہوگئی تھی۔ میں اس آخر الذکر رائے سے اتفاق کرتا ہوں۔

حکم عدولی کی سزا غزوہ احد کی فتح کا شکست میں بدلنا درحقیقت فشل، تنازع فی الامر اور معصیتِ امیر کے جرم کی پاداش میں اللہ کی طرف سے سزا تھی۔ تصور کیجئے کہ سزا کتنی کڑی تھی! ستر صحابہ کرامؓ شہید ہوئے۔ سات سو کل تھے۔ دس فیصد نفری شہید ہوگئی۔ حالانکہ خطار صرف پانچ فی صد کی تھی۔ پھر شہدا کر میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کیسے کیسے جان نثار اور کیسے کیسے ہیرے اور موتی تھے جو کیسی کیسی محنت سے جناب محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے جمع کئے تھے۔ ان ہی میں اسد اللہ و اسد رسولہ حمزہؓ ابن عبد المطلب ہیں، ان ہی میں المقری یعنی مصعبؓ ابن عمیرؓ ہیں کہ جن کی دعوت و تبلیغ اور تعلیم قرآنی سے مدینہ منورہ میں اسلامی انقلاب آیا اور اوس و خزرج کے قبیلوں کے اکثر لوگ دولتِ ایمان سے مشرف ہوئے۔ ۶۸ دوسرے مہاجرین و انصار کے مجاہدین فی سبیل اللہ اور جان نثارانِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم و رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے جامِ شہادت نوش کیا۔ حضورؐ خود بھی مجروح ہوئے، دندانِ مبارک شہید ہوئے۔ خود کی دو کڑیاں حضورؐ کے رخسارِ مبارک میں ایسی گھسی ہیں کہ نکالنے کیلئے زور لگایا نہیں نکلی ہیں۔ پھر دوسرے اصحابؓ نے بمشکل ان کو نکالا ہے۔ حضورؐ پر غشی بھی طاری ہوئی ہے۔ کفار نے ایک موقع پر حضورؐ کا نرغہ کر لیا ہے اور تیروں کی بارش برسائی ہے۔ جان نثاروں نے اپنے جسموں کو حضورؐ کے لئے ڈھال بنایا کہ جو تیر آئیں وہ ہمارے سینوں میں تراز و ہوں محمد کے سینہ مبارک تک نہ پہنچیں صلی اللہ علیہ وسلم ــــ حضرت سعد ابن ابی وقاصؓ بڑے قادر تیر انداز تھے حضورؐ ان کو تیر دیتے اور فرماتے جاتے "سعد تم پر میرے ماں باپ قربان، تیر چلاتے جاؤ" ــــ صرف حضرت سعدؓ وہ خوش بخت صحابی ہیں جن کے لئے حضورؐ نے یہ محبت بھرا کلمہ ارشاد فرمایا۔

الغرض مسلمانوں کو بڑی کھلی شکست ہوئی۔ افراتفری پھیلی۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شہادت کی افواہ بھی پھیل گئی۔ مسلمانوں کے حوصلے پست ہوگئے۔ بہرحال ان حالات میں سیرت نگاروں کے سامنے ایک عجیب سا سوال اور مسئلہ آتا ہے کہ قریش واپس کیوں چلے گئے؟ اس کا میرے پاس بلاتشبیہ جواب یہ ہے کہ ایک حدیث شریف کے مطابق انسان کا دل اللہ تعالیٰ کی دو انگلیوں کے مابین ہوتا ہے۔ وہ جس طرف چاہتا ہے اسے پھیر دیتا ہے۔ اس نے قریش کے دل پھیر دیئے۔ ورنہ وہ اس پوزیشن میں آگئے تھے کہ احد میں موجود تمام مسلمانوں کا صفایا کر دیتے۔ بہرحال بعض ذرائع سے اس کی یہ توجیہہ ملی ہے کہ چونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرامؓ کو لے کر پہاڑ پر چڑھ گئے تھے۔ یہ بھی ایک طرح کی پسپائی (Retreat) ہے ــــ اب جبکہ حضورؐ اپنے اصحاب کے ساتھ پہاڑ پر چڑھ گئے

تھے تو اس وقت بھی اگرچہ خالد ابن ولید رئیس لشکر ابوسفیان سے اصرار کر رہے تھے کہ ہمیں پہاڑ پر چڑھ کر اس معاملہ کو ختم کر دینا چاہیئے، اس قضیہ کو ہمیشہ کے لئے چکا دینا چاہیئے۔ لیکن جیسا کہ میں نے اپنی پہلی تقریر میں کہا تھا کہ ابوسفیان بڑے حقیقت پسند، زیرک اور حالات کا بہت صحیح جائزہ لینے اور ان پر نظر رکھنے والے انسان تھے۔ انہوں نے انکار کر دیا کہ نہیں۔ اس لئے کہ مسلمان بلندی پر ہیں، وہاں سے تیروں اور پتھروں کی بوچھاڑ ہوگی تو ہمارا بہت جانی نقصان ہونے کا اندیشہ ہے۔ بہرحال ہم نے بدلہ لے لیا ہے۔ یہی بہت ہے۔

نعروں کا تبادلہ! پھر انہوں نے دامن کوہ سے نعرہ لگایا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) زندہ ہیں یا فوت ہو گئے! حضورؐ خاموش رہے۔ ادھر سے تین بار اسی نعرے کی تکرار ہوئی۔ تیسرے نعرے پر حضرت عمرؓ سے ضبط نہ ہو سکا۔ انہوں نے نعرہ کا جواب نعرہ سے دیا کہ 'اے دشمن خدا! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زندہ ہیں۔ پھر ابوسفیان نے کہا 'دیکھو یہ یوم بدر کا بدلہ ہے جو آج ہم نے چکا لیا۔ حضرت عمرؓ نے جواباً کہا 'تمہارے مقتول جہنم میں ہیں جبکہ ہمارے شہداء جنت میں ہیں'۔ ابوسفیان نے پھر نعرہ لگایا 'اعلیٰ ھُبل'۔ یہاں ہمیں یہ ملتا ہے کہ مشرکین نے کسی بت کا نعرہ لگایا۔ یہ دراصل خوشی کا موقع تھا۔ ورنہ جب مشکل کا وقت ہوتا تھا تو مشرکین بھی صرف اللہ ہی کو پکارتے تھے۔ یہاں تو انہیں فتح ہو گئی تھی اسی لئے ابوسفیان نے نعرہ لگایا 'اعلیٰ ھُبل'۔ حضورؐ نے فرمایا جواب دو۔ "اَللّٰہُ اَعَزُّ وَاَجَلُّ"، مسلمانوں نے ادھر سے یہ نعرہ بلند کیا۔ اُدھر سے ابوسفیان پھر پکارا 'لَنَا عُزّیٰ وَلَا عُزّیٰ لَکُمْ' "ہمارے لئے تو عزّیٰ دیوی ہے جس کا سایہ ہمارے سروں پر ہے۔ تمہارے لئے کوئی دیوی نہیں ہے" حضورؐ نے فرمایا جواب دو "اَللّٰہُ مَوْلَانَا وَلَا مَوْلٰی لَکُمْ" "اللہ ہمارا مولا ہے، ہمارا پشت پناہ اور مددگار ہے؛ تمہارا کوئی مولا نہیں"۔ پھر ابوسفیان یہ کہہ کر اپنے پورے لشکر کو ساتھ لے کر واپس ہو گیا کہ "اگلے سال یہیں پھر مقابلہ کے لئے ملاقات ہو گی"۔

غزوۂ اُحد کی شکست کے اثرات بہرحال غزوۂ احد کے بعد کے دو سال نبی اکرمؐ اور اہل ایمان کے لئے نہایت پریشان کن اور تکلیف دہ رہے ہیں۔ اس لئے کہ اہل عرب پر مسلمانوں کے رعب، ہیبت اور دھاک کی جو فضا بن گئی تھی وہ بہت حد تک ختم ہو گئی۔ چنانچہ قرآن مجید میں مسلمانوں کی تسلی کے لئے فرمایا گیا کہ: وَتِلْکَ الْاَیَّامُ نُدَاوِلُھَا بَیْنَ النَّاسِ۔ اب بین مدینہ کے قریب آ کر قریش جو اتنا بڑا چرکہ لگا گئے تو ایک تو مسلمانوں

کے دل زخمی ہیں۔ ان کا حوصلہ (Morale) اب اتنا اونچا نہیں رہا جتنا غزوۂ بدر کے بعد ہوگیا تھا۔ دوسرے گردوپیش کے مشرکین کے قبائل پر جو دھاک بیٹھ گئی تھی وہ باقی نہیں رہی۔ وہ اسلامی انقلاب کی دعوت و تحریک کے مقابلہ میں دلیر ہو گئے۔ ان کی طرف سے مخالفت و مزاحمت کے اندیشے پیدا ہوگئے۔

اللہ کی طرف سے تسلّی و تشفّی ان تمام ناموافق و نامساعد حالات میں تسلّی کے لئے فرمایا گیا:
اِنْ يَّمْسَسْكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُهٗ ؕ
مسلمانو! کیوں دل شکستہ ہوتے ہو، اگر تمہیں چرکہ اور زخم لگا ہے تو تمہارے دشمنوں کو بھی ایسا ہی چرکہ اور زخم لگ چکا ہے۔ انہوں نے تو ہمت نہیں ہاری تھی۔ وہ میدانِ بدر میں اپنے ستر مقتول چھوڑ گئے تھے۔ اور ستر قیدی ـــ اس کے باوجود وہ تین ہزار کی نفری لے کر مدینہ پر چڑھائی کے لئے آ گئے۔ تم کیوں ہمت ہار رہے ہو؟ کیوں تنگ دل ہو رہے ہو۔ گھبراؤ نہیں: وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ ـ یہ تو تمہاری غلطی تھی، تمہاری خطا تھی جس پر غزوۂ اُحُد میں تمہیں شکست کی صورت میں سزا دے کر ہم نے تمہیں سبق پڑھایا ہے۔ ورنہ یہ نہ سمجھو کہ اللہ تعالیٰ تمہاری پشت پر نہیں ہے، تمہارا مددگار اور حامی نہیں ہے۔ یہ تو ابھی اندرونِ عرب کا معاملہ ہے، تمہیں تو ابھی قیصر و کسریٰ کی سلطنتوں کو تہ و بالا کرنا ہے۔ اگر آج تمہارا نظم اور ڈسپلن ڈھیلا رہا تو آئندہ کیا ہوگا۔ لہٰذا سبق سکھانا ضروری تھا۔ تمہارے اندر اس کے بغیر نظم کی اہمیت کا احساس کہاں سے آتا! اگر اللہ چاہتا تو اسے معاف کر دیتا اور نظر انداز (condone) کر دیتا۔ وہ قادرِ مطلق ہے۔ وہ ایسا کر سکتا تھا کہ تمہاری اس خطا کے باوجود فتح دے دیتا۔ لیکن اس طرح تمہاری اس موقع کی کمزوری اور غلطی کی اصلاح نہ ہوتی۔ بلکہ اس میں اور اضافہ ہوتا۔ لہٰذا ایک وقتی سی شکست کی صورت میں ہم نے تمہیں متنبہ کر دیا کہ اپنی صفوں (Ranks) کا جائزہ لے لو، جہاں جہاں کمزوریاں ہیں انہیں دور کرنے کی فکر کرو۔ اپنی جمعیت کو اور مضبوط کرو۔ جو نئے نئے لوگ مشرف بایمان ہوئے ہیں، ان کی تربیت کی کمی کو دور کر دو تاکہ یہ بھی اسی طرح کندن بن جائیں جیسے مکّہ سے آئے ہوئے مہاجرین اور السابقون الاوّلون انصار ـــ تمام اہلِ ایمان کو نظم کی پابندی کا خوگر بناؤ۔ تم یہ سب کچھ کر لو تو تم سے استخلاف اور تمکن فی الارض کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے پختہ وعدہ ہے: وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ؕ ـــ

غزوۂ احزاب

بہرحال غزوہ احد کے بعد کے دو سالوں کے عرصہ میں تشویش اور خوف کی حالت رہی پھر یہ حالت اپنے نقطۂ عروج (Climax) کو پہنچی ہے دو سال بعد غزوۂ خندق کے موقع پر۔ ـــــ رمضان المبارک ۲ھ میں غزوہ بدر ہوا۔ پھر شوال ۳ھ میں معرکۂ احد پیش آیا۔ ذیقعدہ ۵ھ میں یعنی دو سال اور ایک ماہ بعد اب قریش اور دیگر قبائل جن میں یہود بھی شامل تھے۔ متحد ہوکر مدینہ پر حملہ آور ہوئے۔ عرب میں اس سے پہلے کبھی اتنا بڑا لشکر جمع ہوا ہی نہیں تھا۔ بارہ ہزار کا لشکر مدینہ پر چڑھائی کے لئے جمع ہوگیا۔ جنوب سے قریش آگئے۔ مشرقی جانب سے کئی قبائل آگئے جن میں سے بنوفزارہ اور بنوغطفان بھی ہیں جو نجد کے علاقے کے بڑے جنگ جو اور بڑے خونخوار قبیلے تھے۔ شمال سے حملہ آور ہوئے یہودی قبائل جو خیبر میں آباد تھے۔ اس طرح ان قبائل نے مدینہ کو اپنے حصار میں لے لیا۔ اس کا نقشہ سورۂ احزاب میں کھینچا گیا ہے۔ اس سورہ مبارکہ میں غزوۂ احزاب پر پورے دو رکوع ہیں۔

بلغار کا نقشہ کفار و مشرکین کی ہمہ جہت یلغار اور کمزور ایمان والوں اور منافقین کے خوف و بے اطمینانی کا نقشہ کھینچا جاتا ہے بہ ایں الفاظ: اِذْ جَآءُوْكُمْ مِّنْ فَوْقِكُمْ وَمِنْ اَسْفَلَ مِنْكُمْ۔ "یاد کرو جب لشکر آگئے تھے تم پر اوپر سے بھی اور نیچے سے بھی" ـــــ چونکہ مدینہ سے مشرق کی طرف اونچائی ہوتی چلی جاتی ہے۔ اسی لئے اس علاقہ کو نجد کہتے ہیں جس کے معنی ہیں اونچائی والا علاقہ۔ لہٰذا جو مشرق سے آئے ان کے لئے فَوْقِكُمْ کے الفاظ آئے۔ اور مغربی ساحل کی طرف ڈھلان اور اترائی ہے۔ چنانچہ قریش اور ان کے حلیف مغرب یعنی نیچائی اور اتار کے راستہ سے آئے۔ لہٰذا ان کے لئے "مِنْ اَسْفَلَ مِنْكُمْ" فرمایا گیا۔ مزید برآں مدینہ کے شمال مغرب کی جانب سے یہودی قبائل جمع ہوکر آگئے تھے ـــــ اس کٹھن موقع پر منافقین اور کمزور ایمان والوں کی کیفیت اسی آیت میں آگے ان الفاظ مبارکہ میں بیان کی گئی ہے کہ "وَاِذْ زَاغَتِ الْاَبْصَارُ وَبَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ وَتَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ الظُّنُوْنَا" "اور یاد کرو جب آنکھیں دہشت و حیرت سے پھرنے لگیں اور خوف و ہراس سے دلوں کا یہ حال تھا کہ وہ گویا گلوں میں آ اٹکے ہیں اور تم اللہ کے بارے میں اٹکلیں لگانے اور بدگمانیوں میں مبتلا ہونے لگے" ـــــ یہ تبصرہ ہے اللہ کی طرف سے اس امتحان پر جو غزوۂ احزاب کی صورت میں اپنے نقطۂ عروج کو پہنچ گیا تھا ـــــ سیرت مطہرہ کا میرا جو حقیر سا معروضی مطالعہ ہے اس کی بنا پر میری رائے ہے کہ ذاتی طور پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر سب سے سخت دن

"یوم طائف" گزرا ہے۔ اور مسلمانوں پر بحیثیت جماعت سب سے سخت اور شدید ایام غزوۂ احزاب کے گذرے ہیں۔ جو قریباً ایک ماہ محیط رہا ہے۔

میں عرض کر چکا ہوں کہ غزوہ احد کے موقع پر تین سو افراد تو بطور منافقین منظر عام پر آ چکے تھے۔ اب غزوہ احزاب تک ان کی تعداد کتنی ہو گی! ـــــ واللہ اعلم۔ بہرحال قرآن مجید سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی معتدبہ تعداد غزوۂ احزاب کے موقع پر موجود تھی۔ ان کے دل ہمارے محاورے کے مطابق بلیوں اچھل رہے ہیں اور ان کو ہر چہار طرف موت نظر آ رہی تھی۔ اور بظاہر احوال بچنے کی کوئی شکل سامنے نہیں تھی۔

غزوۂ احزاب کا میں جب بھی ذکر کرتا ہوں، مجھے جناب نعیم صدیقی صاحب کا یہ شعر اس موقع پر بے ساختہ یاد آ جایا کرتا ہے ؎

اے آندھیو سنبھل کے چلو اس دیار میں
امید کے چراغ جلائے ہوئے ہیں ہم

ہدایت کا ایک چراغ تھا جو مدینہ میں روشن تھا اور اس کو بجھانے کے لئے اتنی بڑی بڑی آندھیاں آ رہی ہیں کہ الامان والحفیظ!

منافقین کی کیفیت امتحان یقیناً شدید تھا۔ نتیجتہً منافقین کے دلوں میں جو خُبث تھا۔ ان کے دلوں میں جو نجاست تھی اور گندگی تھی۔ وہ اس ابتلاء و آزمائش کو دیکھ کر زبان پر آ گئی: وَاِذْ یَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ مَّا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗۤ اِلَّا غُرُوْرًا ۝ "اور جب کہنے لگے منافق اور وہ لوگ جن کے دلوں میں روگ ہے کہ اللہ اور اس کے رسولؐ نے ہم سے جو وعدہ کیا تھا وہ سب فریب تھا"۔ ہم کو دھوکا دے کر مروا دیا۔ ہم سے تو کہا گیا تھا کہ قیصر و کسریٰ کی سلطنتیں تمہارے قدموں میں ہوں گی اور ہو یہ رہا ہے کہ ہم تو رفع حاجت کے لئے بھی باہر نہیں جا سکتے۔ کھانے کو کچھ نہیں۔ ہمارے باغات حملہ آوروں نے اجاڑ دیئے۔ چاروں طرف سے محاصرہ ہے، اندر کوئی چیز نہیں ہے۔ فاقہ پہ فاقے آ رہے ہیں بغض کی سردی نے الگ زندگی اجیرن کر رکھی ہے منافقین کی یہ وہ باتیں ہیں جو ان کے دلوں سے اچھل کر زبانوں پر آ گئی ہیں۔ ان باتوں کا تذکرہ سیرت النبی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام اور کتب احادیث میں ملتا ہے۔

اہل ایمان کی کیفیات ادھر مومنین صادقین کی کیفیت کیا تھی؟ ملاحظہ ہو۔ وَلَمَّا رَاَ الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ قَالُوْا هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَصَدَقَ

اللّٰہ وَرَسُوْلُہٗ " اور حقیقی مومنین کا اس وقت حال یہ تھا ۔۔ جب انہوں نے دشمنوں کے لشکروں کو دیکھا تو وہ پکار اٹھے کہ یہی وہ بات ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے اور اس کے رسولؐ نے ہم سے وعدہ کیا تھا ۔ اور اللہ اور اس کے رسولؐ کی بات بالکل سچی تھی " یہ کون سا وعدہ ہے جس کی طرف یہ صادق القول مومنین اشارہ کر رہے ہیں! قرآن مجید میں متعدد مقامات پر اللہ کی طرف سے ، آزمائش و امتحان اور ابتلا کے وعدوں کا ذکر آیا ہے ۔ مثلاً سورۃ العنکبوت کی آیات ۲-۳ میں فرمایا۔

اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَکُوْٓا اَنْ	" کیا لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ وہ بس
یَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَھُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ ۝	اتنا کہنے پر چھوڑ دیئے جائینگے کہ ہم ایمان
وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِھِمْ	لائے اور ان کو آزمایا نہ جائے گا؟ حالانکہ
فَلَیَعْلَمَنَّ اللّٰہُ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا	ہم ان سب لوگوں کی آزمائش کر چکے ہیں جو
وَلَیَعْلَمَنَّ الْکٰذِبِیْنَ ۝	ان سے پہلے گزرے ہیں ۔ اللہ کو تو ضرور

یہ دیکھنا ہے کہ سچے کون ہیں اور جھوٹے کون ہیں؟ "

سورۂ بقرہ کی آیت ۱۵۵ میں فرمایا :

وَلَنَبْلُوَنَّکُمْ بِشَیْءٍ مِّنَ	" اور ہم البتہ تم کو خوف و خطر اور بھوک
الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ	اور مال و جان اور فصلوں کی تباہی میں
الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ؕ	مبتلا کر کے تمہارا امتحان لیں گے ، تمہیں
وَبَشِّرِ الصّٰبِرِیْنَ	آزمائیں گے ۔ جو ان حالات میں صبر کریں

تو ان کو (اے نبیؐ) بشارت دے دیجئے "

چنانچہ غزوۂ احزاب کے مصائب کو دیکھ کر مومنین صادقین کے ذہن ان پیشگی تنبیہات کی طرف منتقل ہو گئے اور ان کی زبانوں پر فی الفور آ گیا :

"ھٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ وَصَدَقَ اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ ۔"

ایک عجیب نقشہ بہر حال اس غزوہ احزاب میں کفار و مشرکین کے لشکروں کا محاصرہ خاصا طول پکڑ گیا ۔ اس دوران حالات بڑے ہی سخت قسم کے پیش آئے ہیں ۔ اس غزوہ کا وہ نقشہ بھی میں آپ کے سامنے لے آؤں کہ جب خندق کھودی جا رہی تھی تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس کام میں بنفس نفیس شریک تھے ۔ پھاوڑا اٹھا اٹھا کر خندق سے باہر پھینک رہے تھے ۔ چونکہ ان دنوں شدید قحط کا عالم تھا ۔ لہٰذا صحابہ کرامؓ نے اپنے پیٹوں پر چادروں کے ساتھ کس کر پتھر باندھے

ہوتے ہیں تاکہ کمریں دوہری نہ ہو جائیں۔ اس لئے کہ شدید بھوک کی وجہ سے معدہ تشنج میں آتا ہے تو دراصل یہ اس معدے کو بہلانے کی ایک شکل ہے کہ اگر اس پر بھاری بوجھ باندھ دیا جائے تو اس کو وہ بھوک کا تشنج (Hunger Pain) نہیں ہوگا۔ بعض صحابہ کرامؓ حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انہوں نے اپنے کرتے اٹھا کر پتھر دکھائے اور عرض کیا کہ حضورؐ اب فاقہ ناقابلِ برداشت ہو رہا ہے، ہم نے اسی لئے پتھر باندھ رکھے ہیں۔ نبی اکرمؐ اپنا کرتہ اٹھا کر دکھاتے ہیں، وہاں دو پتھر بندھے ہوئے تھے۔

یہ دراصل حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کا مشورہ تھا کہ خندق کھود دی جائے۔ عرب تو جانتے ہی نہیں تھے کہ خندق کس بلا کا نام ہے۔ پرانی جنگوں کے لئے جو طریقے اختیار (Develop) ہوئے تھے تو ان میں شہر پناہ کے گرد خندق کھودنے کا رواج بھی تھا۔ اہلِ ایران دفاع کے اس طریقہ سے بخوبی واقف تھے۔ ایران اور روم کی تو کئی سو سال سے جنگ چل رہی تھی۔ تاریخ دونوں کے مابین جھولا جھول رہی تھی۔ کبھی رومی ایران کے دارالسلطنت مدائن تک چڑھ دوڑتے تھے۔ کبھی ایرانی ان کو ایشیائے کوچک میں دھکیل دیتے تھے۔ تو جب مدینہ میں خبر پہنچی کہ تین اطراف سے کفار و مشرکین کا بارہ ہزار کا لشکر مدینہ پر چڑھائی کے لئے چلا آ رہا ہے تو حضرت سلمان فارسیؓ نے مشورہ دیا کہ مدینہ کو پشت پر رکھتے ہوئے خندق کھود دی جائے تاکہ خندق کی وجہ سے دشمن براہ راست مدینہ پر یورش نہ کر سکیں۔ چنانچہ خندق کھودنے کا کام تیزی سے شروع ہو گیا۔ یہ سخت سردی کا موسم تھا۔

رجزیہ اشعار روایات میں خندق کی کھدائی کے وقت دو اشعار کا ذکر ملتا ہے۔ محبتِ الٰہی میں سرشار صحابہ کرامؓ اور ان کے سالارِ اعظم جنابِ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس سنگلاخ زمین کی کھدائی پر جرأتِ مومنانہ اور ہمتِ مردانہ کے ساتھ کدالیں چلا رہے تھے اور صحابہ کرامؓ ضرب لگاتے ہوئے کورس کے انداز میں کہتے جاتے تھے:

اَللّٰھُمَّ لَا عَیْشَ اِلَّا عَیْشُ الْاٰخِرَۃ ط

اور حضورؐ جواب دے رہے تھے۔

فَاغْفِرِ الْاَنْصَارَ وَالْمُھَاجِرَۃ ط

صحابہ کرامؓ کے قول کا مطلب کیا ہے؟ "اے اللہ آخرت کی زندگی اصل زندگی ہے، آخرت کا عیش اصل عیش ہے۔" گویا ان کے نزدیک اس وقت کی کلفتیں، تکالیف اور مصیبتیں ہیچ ہیں۔ انہیں تو آخرت کی فوز و فلاح چاہیئے۔ اور حضورؐ کا جواب ہوتا تھا۔ "اے اللہ! پس معاف فرما دے بخشش فرما دے ان انصار و مہاجرین کی جماعت کی۔" دوسرا شعر جس کا تذکرہ روایات میں ملتا ہے

وہ نظمِ جماعت کی اساس و بنیاد بیعت کے ضمن میں بہت اہم ہے۔ صحابہ کرامؓ ترانہ کے انداز میں کدالوں کی ضرب کے ساتھ اس شعر کو پڑھا کرتے تھے:

نَحْنُ الَّذِيْنَ بَايَعُوْا مُحَمَّدًا عَلَى الْجِهَادِ مَا بَقِيْنَا اَبَدًا!

"ہم وہ لوگ ہیں جنہوں نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے جہاد کی بیعت کی ہے۔ اب یہ جہاد اس وقت تک جاری رہے گا جس وقت تک جان میں جان ہے۔"

جسم و جان کا تعلق منقطع ہو جائے تو بات دوسری ہے۔ جب تک یہ تعلق باقی ہے جہاد جاری رہے گا۔ یہ ہے صحابہ کرامؓ کی جماعت کی وہ شان جس کی بنیاد بیعت ہے۔

نصرتِ الٰہی بہرحال اللہ تعالیٰ نے اپنی خصوصی مدد اور نصرت و تائید سے اہلِ ایمان کو اس نرغہ اور محاصرہ سے نجات دلائی جو بیس دن تک جاری رہا تھا۔ ایک شب بہت زبردست آندھی آئی جس سے ان کے لشکر تلپٹ ہو گئے۔ اکثر خیمے اکھڑ کر آندھی کے ساتھ تتر بتر ہو گئے۔ بڑے بڑے چولہوں پہ جو بڑی بڑی دیگیں چڑھی ہوئی تھیں، وہ اُلٹ گئیں۔ ان چولہوں کی وجہ سے ان کے خیموں میں آگ لگ گئی۔ یوں سمجھئے کہ یہ ایک غیبی تدبیر تھی جس سے ان کے حوصلے اس درجہ پست ہو گئے کہ صبح تک تمام لشکر منتشر ہو چکا تھا۔ تمام قبائل اپنے اپنے مستقروں کی طرف کوچ کر گئے۔ اسی کا ذکر ہے سورۂ احزاب کی آیت ۹ میں:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَآءَتْكُمْ جُنُوْدٌ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا وَّجُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا ۭ وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرًا ۔

"اے اہلِ ایمان! اللہ کا احسان یاد کرو جو تم پر ہوا۔ جب چڑھ آئیں تم پر فوجیں پھر ہم نے ان پر بھیجدی ہوا (آندھی) اور (فرشتوں کی) وہ فوجیں جو تم نے نہیں دیکھیں۔ اور اللہ تمہارے تمام اعمال کو دیکھنے والا ہے۔"

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے چند تدابیر اور بھی اختیار فرمائی تھیں، لیکن ان کی تفصیل میں جانے کا یہ موقع نہیں ہے۔ ایسے محسوس ہوتا ہے کہ اس غزوۂ احزاب کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ کو اہلِ ایمان کا امتحان لینا تھا۔ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کرنا مقصود تھا۔ نظر آجائے کہ کون کتنے پانی میں ہے یا سب جان لیں کہ کون ان میں سے منافق ہیں اور کون وہ ہیں جو کڑی سے کڑی آزمائش اور سخت سے سخت امتحان میں ثابت قدم رہ سکتے ہیں! اب ـــــ امتحان ہو گیا

تو ایک آندھی اور فرشتوں کا ایک لشکر کافی تھا۔ کفار و مشرکین کا بارہ ہزار کا لشکر اللہ کی قدرت کے مقابلہ میں تو پرکاہ کی حیثیت بھی نہیں رکھتا تھا۔ بارہ ہزار نہیں بارہ لاکھ کا بھی لشکر ہوتا تو اس کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ ایک آندھی نے معاملہ پلٹ اور تتر بتر کر دیا اور کفار و مشرکین جو ایک زبردست جمعیت کی شکل میں اور بڑے بڑے ارمانوں اور بڑی بڑی تیاریوں کے ساتھ دور دراز کا سفر کر کے ہدایت کے چراغ کو بجھانے آئے تھے ایک رات ہی میں منتشر ہو گئے۔ معاملہ ختم ہو گیا۔ صبح صادق سے قبل ہی ہر ایک نے اپنی اپنی راہ پکڑی۔ صبح مسلمانوں نے دیکھا تو میدان خالی تھا

نبی اکرمؐ کا تاریخی ارشاد اس موقع پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو تاریخی الفاظ ارشاد فرمائے۔ وہ بھی سن لیجئے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولؐ کو کتنی دور رس نگاہ، کتنی بصیرت و فراست عطا فرمائی تھی۔ کس انقلابی رہنما کے لئے یہ وصف (Quality) اشد ضروری اور لازمی (Essential) ہے کہ وہ حالات پر صحیح صحیح نگاہ رکھے ـــــ چند اصولوں کو جان لینا اور ان کو بیان کرتے چلے جانا ہی سب کچھ نہیں۔ ٹھیک ہے یہ بھی ایک کام ہے اور اس میں کوئی بہت زیادہ مشکل درپیش بھی نہیں آتی۔ اس کے ساتھ ساتھ ایسی صلاحیت اور نگاہ دور رس کی بھی شدید ضرورت ہوتی ہے کہ حالات کی نبض پر بھی ٹھیک ٹھیک ہاتھ ہو۔ صحیح اندازہ ہو کہ حالات کا رُخ کیا ہے! وہ کدھر جا رہے ہیں! صحیح صحیح تشخیص (Assessment) ہو کہ کتنے پانی میں ہیں! ہمارا دشمن کتنے پانی میں ہے! اس کی طاقت کیا ہے! اس کے اور ہمارے اثرات کا تناسب کیا ہے! ظاہر بات ہے کہ ایک انقلابی عمل میں ان سب امور پر گہری نگاہ رکھنی اشد ضروری ہے اور ناگزیر ہے۔ لیکن اگر صرف ایک خانقاہ ہے، اس میں لوگوں کی تربیت کرنی ہے، اس کے لئے بھی ایک خاص صلاحیت درکار ہے۔ لیکن اس میں ان چیزوں پر نگاہ ہونے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ ایک دار العلوم ہے، درس دینا ہے، قرآن پڑھانا ہے۔ حدیث و فقہ پڑھانی ہے، ان کاموں کے لئے ایک خاص صلاحیت کی ضرورت ہے۔ وہاں بھی ان امور پر نظر ہونی ضروری نہیں ہے ـــ لیکن یہاں اصل ضرورت اس بات کی ہے کہ اس امر پر نگاہ ہو کہ انقلابی دعوت اور تحریک کو مختلف مراحل میں گزار کر اور نکال کر اسے کامیابی تک کیسے پہنچا دیا جائے!۔ یہ شئے دگر ہے۔ اس کے لئے اور قسم کی صلاحیتیں چاہئیں۔ اس کی ایک عظیم مثال ہے۔ جو غزوۂ احزاب کے متصلاً بعد سیرتِ مطہرہ میں نظر آتی ہے۔ غزوۂ احزاب کے موقع پر جس کا دوسرا نام غزوہ خندق بھی ہے، اگرچہ قریش بارہ ہزار کا لشکر لے آئے تھے، جس کے متعلق

آپ کو بتا چکا ہوں کہ عرب کی حد تک اس وقت تک کی تاریخ میں اتنا بڑا لشکر پہلی بار جمع ہوا تھا۔ اب جو یہ قافلہ منتشر ہوا اور بھیڑ چھٹی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمادیا۔ صحابہ کرامؓ کو خوش خبری سنادی کہ:

لَنْ تَغْزُوْكُمْ قُرَيْشٌ بَعْدَ عَامِكُمْ هٰذَا وَلٰكِنَّكُمْ تَغْزُوْنَهُمْ

"اس سال کے بعد اب قریش تم پر حملہ آور نہیں ہو سکتے بلکہ اب تم ان پر چڑھائی کرو گے"

میرے نزدیک سورہ صف بھی اسی موقع پر نازل ہوئی ہے جس میں یہ آیتِ مبارکہ موجود ہے:

وَاُخْرٰى تُحِبُّوْنَهَا ۭ نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِيْبٌ ۭ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝

"اور اے مسلمانو! ایک دوسری چیز جو تمہیں محبوب ہے یعنی اللہ کی مدد ۔ تو وہ آیا ہی چاہتی ہے اور اب فتح دور نہیں ہے (تمہارے قدموں کو چومنے والی ہے) اور اے نبیؐ! اہلِ ایمان کو بشارت سنادیجئے"

—— نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو الفاظ فرمائے ہیں کہ: لَنْ تَغْزُوْكُمْ قُرَيْشٌ بَعْدَ عَامِكُمْ هٰذَا وَلٰكِنَّكُمْ تَغْزُوْنَهُمْ —— تو میرے نزدیک یہ الفاظ حضورؐ نے سورہ صف کے اس حکم وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ کے امتثالِ امر میں فرمائے ہیں۔ واللہ اعلم

نبی اکرمؐ کی نگاہِ دوررس نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بخوبی اندازہ تھا کہ کتنی محنتوں اور کوششوں سے قریش نے اپنے لشکر کی تیاری کی ہوگی اور اپنے حلیف قبائل کو اپنا ساتھ دینے پر آمادہ کیا ہوگا۔ بنو غطفان، بنو فزارہ اور خیبر کے یہود کے قبائل کو آمادہ کرنے کے لئے کتنی سفارتیں بھیجی ہوں گی، کتنی خط و کتابت کی ہوگی اور اس کام کے لئے پیام کے سلسلہ میں کتنے سوار دوڑائے ہوں گے —— یہ سارے پاپڑ بیل کر قریش نے جو اتنی طاقت جمع کی تھی اور اسے لے کر وہ مدینہ پر چڑھ دوڑے تھے لیکن نتیجہ کیا نکلا! یہ کہ بے نیل مرام واپس آنا پڑا۔ ساری محنتیں اور کوششیں اکارت گئیں۔ اتنی بڑی جمعیت! لیکن قدرتِ الٰہی کے سامنے اس کی حیثیت کیا تھی! اللہ تعالیٰ نے ایک آندھی بھیج دی اور ان کے تمام ارمان ملیامیٹ ہو گئے۔ حضورؐ کو اندازہ تھا کہ اس ہزیمت سے قریش کے حوصلے جو پست ہو گئے ہیں تو اب قریش یہ جرأت نہیں کر سکتے کہ مدینہ پر دوبارہ حملہ کرنے کے متعلق سوچیں لہٰذا حضورؐ نے اہلِ ایمان کو بشارت سنادی کہ اس سال کے بعد اب قریش تم پر حملہ نہیں کر سکتے۔ بلکہ اب تم چڑھائی کر کے جاؤ گے، اب پیشقدمی تمہاری طرف سے ہوگی۔ اب جنگ کے لئے بھی اقدام ہماری طرف سے ہوگا۔ جو اب تک قریش کے ہاتھ میں تھا۔

حضورؐ کا اہم اقدام چنانچہ اگلے ہی سال نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم عمرہ کے لئے مکّہ کے سفر کا قصد فرماتے ہیں۔ دیکھئے یہ بالکل Assessment کا معاملہ ہے حضورؐ کتنا بڑا خطرہ (Risk) مول لے رہے ہیں! حضورؐ خواب دیکھتے ہیں کہ میں عمرہ کر رہا ہوں ـــ چنانچہ اعلان فرما دیتے ہیں اور تیاری بھی شروع فرما دیتے ہیں۔ لیکن ان حالات میں مکّہ جانا! کتنا دلیرانہ (Bold) قدم اٹھانے کا حضورؐ فیصلہ فرما رہے ہیں۔ مکّہ والے برداشت کریں گے کہ اہلِ ایمان کو مکّہ میں داخل ہونے کی اجازت دیں!! اپنے گھر میں تو بلّی بھی شیر ہوتی ہے۔ قریش کیسے گوارا کریں گے کہ مسلمان مکّہ میں داخل ہوں! چاہے عمرہ ہی کے لئے آئے ہوں ـــ

عمرہ کی تیاری یہ بات نہیں تھی کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اندازہ نہیں تھا کہ مکّہ والوں کی طرف سے کتنی شدید مزاحمتیں ہوں گی۔ لیکن نبی کا خواب بھی وحی ہوتا ہے۔ لہٰذا اس اشارۂ غیبی کی بنیاد پر حضورؐ نے عمرہ کے قصد کا فیصلہ فرمالیا۔ یہ خبر مدینہ میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ چودہ سو جاں نثار ساتھ چلنے کے لئے تیار ہوگئے ـــ اس موقع پر آپ حضرات یہ بات جان لیجئے کہ جو صحابہ کرامؓ اس وقت حضورؐ کے ساتھ جانے کے لئے تیار ہوگئے تھے، وہ اچھی طرح سمجھتے تھے کہ وہ گویا موت کے منہ میں جا رہے ہیں۔ ٹھیک ہے عمرہ کی نیت سے جا رہے ہیں، لیکن قریش کے نزدیک تو یہ ایک نوع کی چڑھائی تھی۔ وہ عمرہ کے لئے اہلِ ایمان کو مکّہ میں داخل ہونے دیں تو گویا یہ ان کے لئے اپنی رہی سہی ساکھ اور بچا کھچا وقار بھی ہمیشہ کے لئے خود اپنے ہاتھوں خاک میں ملانے کے مترادف تھا۔ یہ تو ان کے لئے ایک نوع کی شکست تھی کہ وہ مسلمانوں کو عمرہ کرنے دیتے۔ اس کے بعد تو عرب میں ان کی کوئی حیثیت باقی نہ رہتی۔

مکّہ کی طرف کوچ لہٰذا اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ یہ بہت بڑا اور اہم اقدام ہے۔ جان جوکھوں میں ڈالنے والا قدم تھا۔ چودہ سو صحابہ کرامؓ حضورؐ کے ہمراہ ہیں۔ احرام باندھے ہوئے ہیں۔ ھَدیٰ کے جانور ساتھ ہیں۔ صرف تلواریں پاس ہیں لیکن وہ بھی نیام میں ـــ یہ ہے وہ اقدام جس کی تفصیلات میں ان شاء اللہ آئندہ جمعہ کو بیان کروں گا۔ جو صلح حدیبیہ پر منتج ہوا۔ جس کو قرآن مجید نے فتح مبین قرار دیا ہے۔ اِنَّا فَتَحۡنَا لَکَ فَتۡحًا مُّبِیۡنًا ۝ یہ صلح حدیبیہ جو ذیقعدہ ۶ھ میں منعقد ہوئی ہے۔ وہ سیرتِ مطہرہ کے اس چھٹے مرحلہ میں ایک اہم موڑ (Turning Point) کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کے بعد نبی اکرمؐ کی جدوجہد کے دو حصّے ہو جائیں گے۔ یوں سمجھئے کہ ایک حصّہ وہ ہے کہ جزیرہ نمائے عرب کی حد تک اسلامی انقلاب کی تکمیل ہونے والی ہے۔ فتح مکّہ قریب ہوگئی ہے۔

لیکن صلح حدیبیہ کے متصلاً بعد ہی انقلابِ محمدی علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ والسلام کا بین الاقوامی سطح پر بھی آغاز ہوگیا۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ ان امور پر اگلی مرتبہ گفتگو ہوگی۔ مجھے توقع ہے کہ آئندہ جمعہ کو سیرت النبیؐ کے آئینہ میں انقلابی عمل کا جو بیان ہے ان شاء اللہ اس کی تکمیل ہو جائے گی اور اس سے اگلے جمعہ کو اللہ نے چاہا تو ہم تفصیل کے ساتھ اس موضوع پر گفتگو کریں گے کہ اس دور میں ہم سیرتِ مطہرہ کے انقلابی عمل سے کیا کیا چیزیں مستنبط کریں گے۔ کون کون سی چیزیں ہمیں جوں کی توں لینی ہوں گی اور کن کن امور میں ہمیں دو وجوہ کی بنا پر فرق ملحوظ رکھنا پڑے گا۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ یہ مسلمانوں کے ساتھ معاملہ ہے۔ کفار و مشرکین کے ساتھ نہیں۔ اور دوسری وجہ یہ کہ حالات کی تبدیلی کے باعث عوام بنتے ہیں جبکہ حکومتوں کے پاس بہت بڑی طاقت ہے۔ ان دو وجوہ کی بنا پر حکمت عملی میں کیا کیا تغیّر و تبدّل کرنا ہوگا۔ اس پر ان شاء اللہ بعد میں گفتگو ہوگی۔

بَارَكَ اللّٰهُ لِيْ وَلَكُمْ فِي الْقُرْاٰنِ الْعَظِيْمِ وَنَفَعَنِيْ وَاِيَّاكُمْ بِالْاٰيٰتِ وَالذِّكْرِ الْحَكِيْمِ ــــ وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

(جاری ہے)

بقیہ : الہدیٰ

کے ساتھ نبی اکرمؐ کا یہ قول موجود ہے کہ یہ نو وارد حضرت جبریلؑ تھے جو انسانی شکل میں آئے تھے اور سوال و جواب کے ذریعہ صحابہ کرامؓ کو دین کے مہتم بالشان امور کی تعلیم و تبیین ان کے پیشِ نظر تھی۔

حضرات! سورہ حٰمٓ السجدہ کی آیات ۳۰ تا ۳۲ پر ہم نے دو نشستوں میں کسی قدر غور مکمل کیا ہے۔ اگرچہ مجھے شدّت کے ساتھ یہ احساس ہے کہ جو اہم اور عظیم مضامین ان تین آیات میں وارد ہوئے ہیں ان کا کسی درجہ میں بھی حق ادا نہیں ہو سکا۔ تاہم ان آیات کے ذریعے جو بھی علم صحیح ہمارے سامنے آیا ہے اللہ تعالیٰ ہمیں اس علم سے صحیح طور پر مستفید ہونے کی توفیق عطا فرمائے انشاء اللہ آئندہ نشستوں میں ہم آیات ۳۳ تا ۳۶ کا مطالعہ کریں گے۔

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

اَلْھُدٰی

(نشست ۳۰)

(مباحثِ ایمان)

سُورہ حٰمٓ السجدہ کی آیات ۳۰ تا ۳۶ کی روشنی میں

حَظِّ عظِیم

ڈاکٹر اسرار احمد

(کے ٹیلیویژن پر نشر شدہ دروس کا سلسلہ)

(۲)

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ' نَحْمَدُهٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِهِ الْكَرِیْمِ۔ اما بعد'

اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِیْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ۝ نَحْنُ اَوْلِیٰٓؤُكُمْ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَفِی الْاٰخِرَةِ ۚ وَلَكُمْ فِیْهَا مَا تَشْتَهِیْٓ اَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِیْهَا مَا تَدَّعُوْنَ ۝ نُزُلًا مِّنْ غَفُوْرٍ رَّحِیْمٍ ۝

(آیات : ۳۰ تا ۳۲)

صَدَقَ اللّٰهُ الْعَظِیْمُ

"یقیناً جن لوگوں نے کہا، ہمارا رب اللہ ہے۔ پھر اس پر جم گئے، اُن پر ملائکہ کا نزول ہوتا ہے (اور وُہ کہتے ہیں)، کہ نہ خوف کھاؤ، نہ غمگین ہو بلکہ خوشخبری حاصل کرو اس جنت کی جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا۔ ہم ہیں تمہارے پشت پناہ دُنیا کی زندگی میں بھی اور آخرت میں بھی اور

اُس جنت میں تمہیں ملے گا جو کچھ چاہیں گے تمہارے جی اور وہاں مہیّا کر دیا جائے گا جس کی تم طلب کرو گے۔ یہ مہمان نوازی ہو گی اُس ہستی کی طرف سے جو غفور بھی ہے، رحیم بھی ہے "

سچ فرمایا اللہ بزرگ و برتر نے !

محترم ناظرین اور معزّز سامعین !

اِن آیاتِ مبارکہ کے ایک حصّہ پر ہم سابقہ نشست میں کسی قدر غور کر چکے ہیں یعنی یہ کہ ایمان کا لبِ لباب ہے اللہ تعالیٰ کی ربوبیت پر انسان کے دل کا جم جانا، ٹھک جانا اور اِس کا نتیجہ ہے خوف اور غم سے نجات پا جانا — اِن آیات میں جو دوسرے مضامین آئے ہیں، اب ہم اُن کی طرف توجہ کرتے ہیں۔ ملائکہ کا جو نزول اِن آیات میں مذکور ہوا ہے، اِس کے بارے میں ایک بات تو بالکل متفق علیہ ہے کہ اہلِ ایمان پر موت کے وقت، موت سے متصلاً قبل فرشتوں کا نزول ہوتا ہے — پھر عالمِ برزخ اور عالمِ آخرت میں ملائکہ سے اہلِ ایمان کی ملاقات اظہر من الشمس ہے ہی — اِس حیاتِ دنیوی میں فرشتوں کے نزول کے متعلق یہ بات بہت سے لوگوں کے تجربات سے بھی ثابت ہے۔ اللہ کے نیک بندوں کے بارے میں ایسے متعدّد واقعات ملتے ہیں کہ جب اُن کی موت کا وقت قریب آیا تو انہوں نے آس پاس بیٹھے لوگوں سے کہا کہ ہٹ جاؤ — جیسے کچھ غیر مرئی ہستیوں کی آمد ہو رہی تھی اور مرنے والوں نے ان کے لئے راستہ صاف کرنے کے لئے کہا ہے۔ یہ بات بالکل سمجھ میں آتی ہے کہ جب کوئی صاحبِ ایمان شخص، اِس عالم سے عالمِ برزخ یا عالمِ آخرۃ کی طرف منتقل ہو رہا ہو تو اُس عالم کے جو کارندے ہیں وہ اس صاحبِ ایمان کی روح کے استقبال کے لئے آتے ہیں اور اسے خوشخبری دیتے ہیں جیسے سورۂ فجر میں خود اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان نقل ہوا ہے :

يَا أَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِي إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً

اَے نفسِ مطمئنہ، اَے وہ انسان خواہ وہ مرد ہو یا عورت جو پورے اطمینان و سکون اور

دل جمعی کے ساتھ اللہ کی اطاعت، اللہ کی بندگی اور اللہ کی محبت میں مگن رہا ہو اور اُسی حال میں اُس نے اپنی پوری زندگی بسر کی ہو اُس سے کہا جائے گا کہ اب لوٹ جا اپنے پروردگار کی طرف، اِس حال میں کہ تو اس سے راضی اور وہ تجھ سے راضی!

فَادْخُلِیْ فِیْ عِبَادِیْ وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ ۝ اب داخل ہو جا میرے محبوب بندوں میں اور داخل ہو جا میری جنت میں۔

یہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے اپنے نیک بندوں کی ارواح کیلئے استقبالیہ کلمات ہیں۔ لہٰذا موت کے وقت ایک بندۂ مؤمن کی روح کے استقبال کے لئے ملائکہ کا نزول بالکل قرینِ قیاس ہے ـــــ البتہ یہ بات سمجھنی ہوگی کہ اہلِ ایمان پر حیاتِ دنیوی کے دوران بھی ملائکہ کا نزول ہوتا ہے یا نہیں! اِس کو سمجھنے کے لئے، یہ بات جان لینی چاہئے کہ خیر وشر کی کچھ تو وہ قوتیں ہیں جو ہمارے باطن میں ہیں ہمارا نفسِ امّارہ ہے: اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌ بِالسُّوْٓءِ جو ہمیں برائی کا حکم دیتا ہے جو ہمیں بُرے کاموں کی طرف للچاتا ہے۔ جو ہمیں بدی و برائی کے لئے اکساتا ہے جو ہمارے اندر تکبّر پیدا کرتا ہے۔ عُجب پیدا کرتا ہے۔ مال کی محبت پیدا کرتا ہے۔ حسد پیدا کرتا ہے شہوت اور نفسانی خواہشات کو ابھارتا ہے۔ جائز و ناجائز کی تمیز و امتیاز کے بعد اپنی مرضیات کو پُورا کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ دنیا کی محبت کو ہمارے دلوں میں راسخ کرتا ہے۔

كَلَّا بَلْ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ ۝ وَتَذَرُوْنَ الْاٰخِرَةَ ۝ ہرگز نہیں اصل بات یہ ہے کہ تم جلدی حاصل ہونے والی چیز یعنی دنیا سے محبت رکھتے ہو اور آخرت کو چھوڑ دیتے ہو۔

لیکن دوسری طرف خود ہمارے باطن میں نفسِ لوّامہ بھی ہے جسے ہم ضمیر سے تعبیر کرتے ہیں۔ ہمارے نفس میں قلب و رُوح کی وہ باطنی قوتیں بھی موجود ہیں جو خیر کی طرف، نیکی کی طرف، بھلائی کی طرف بلانے والی ہیں۔ ہر انسان خیر وشر کی اِس کشمکش کو اپنے باطن میں محسوس کرتا ہے۔ خارج میں بھی خیر کی دعوت دینے والے موجود ہیں اور شر کی طرف بلانے والے بھی ـــــ انسانوں میں انبیائے کرام علیہم

الصلوٰۃ والسلام خیر کی طرف دعوت دینے والے تھے۔ اولیاء اللہ خیر کی طرف بلانے والے تھے۔ صلحاء واتقیاء بھلائی کی تلقین کرنے والے بھی ہر دور میں موجود رہے تھے اور اب بھی موجود ہیں۔ اس کے ساتھ ہی اشرار اور فساق وفجار بھی ہر دور میں رہے ہیں اور آج بھی موجود ہیں جو برائی اور بدی کو نہایت خوشنما اور دل فریب بنا کر لوگوں کو اس راستے کی طرف کھینچنے اور اُن کو اپنے رنگ میں رنگنے کی بڑی منظم کوششیں کرتے ہیں ـــــ پھر شر کی طرف بلانے والی غیر مرئی قوتیں بھی ہیں جو ہمیں نظر نہیں آتیں، شیاطین جن ہیں جو ہمیں برائی، بدی اور شر کی ترغیب دیتے ہیں جو ہمیں نیکیوں سے روکنے کی کوششیں کرتے ہیں اگرچہ وہ ہمیں نظر نہیں آتے، لیکن اُن کا وجود ہے۔ لہٰذا جان لیجئے کہ اسی طریقہ سے ملائکہ ہیں جو خیر کو تقویت دیتے ہیں۔ جو اہلِ ایمان کی تثبیتِ قلبی کا ذریعہ بنتے ہیں۔ خیر وشر کی کشمکش اور معرکہ میں اُن کے قدم جماتے ہیں۔ اُن کے دلوں کے اندر سکینت وثبات، ٹھہراؤ اور جماؤ کی کیفیت پیدا کرتے ہیں۔ یہ بات قرآنِ مجید سے ثابت ہے اور احادیث صحیحہ سے بھی ثابت ہے۔ غزوۂ بدر میں فرشتوں کا نزول ہوا۔ سورۃ الانفال کی آیت نمبر ۹ میں فرمایا:

اِذْ تَسْتَغِيْثُوْنَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ	"یاد کرو وہ موقع جب کہ تم اپنے
لَكُمْ اَنِّيْ مُمِدُّكُمْ بِاَلْفٍ مِّنَ	رب سے فریاد کر رہے تھے،
الْمَلٰٓئِكَةِ مُرْدِفِيْنَ ۝	اس نے تمہاری فریاد قبول کرلی اور

اس نے جواب میں کہا کہ میں تمہاری مدد کے لئے پے در پے ایک ہزار فرشتے بھیج رہا ہوں۔"

اسی سورۃ کی آیت نمبر ۱۲ میں فرمایا:

اِذْ يُوْحِيْ رَبُّكَ اِلَى الْمَلٰٓئِكَةِ اَنِّيْ	"(اے نبیؐ) یاد کرو وہ وقت جب
مَعَكُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ؕ	آپ کا رب فرشتوں کو وحی کر

رہا تھا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں، تم اہلِ ایمان کو ثابت قدم رکھو!"

ایسی ہی آیات کے مطالعہ سے متاثر ہوکر ہی حکیم الامت علامہ اقبال مرحوم

نے کہا تھا ؎ فضائے بدر پیدا کر فرشتے تیری نصرت کو
اُتر سکتے ہیں گردوں سے قطار اندر قطار اب بھی

ایک حدیث صحیح میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے

مَا اجْتَمَعَ قَوْمٌ فِیْ بَیْتٍ مِّنْ بُیُوْتِ اللّٰہِ یَتْلُوْنَ کِتَابَ اللّٰہِ ، وَ یَتَدَارَسُوْنَہٗ بَیْنَھُمْ اِلَّا نَزَلَتْ عَلَیْھِمُ السَّکِیْنَۃُ وَغَشِیَتْھُمُ الرَّحْمَۃُ وَحَفَّتْھُمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ وَذَکَرَھُمُ اللّٰہُ فِیْ مَنْ عِنْدَہٗ۔

" جب کبھی لوگ اللہ کے گھروں میں سے کسی گھر میں جمع ہوتے ہیں اللہ کی کتاب پڑھنے کے لئے اور باہم درس و تدریس کے لئے تو ان پر سکینت کا نزول ہوتا ہے۔ دل کو سکون حاصل ہوتا ہے۔ ان پر رحمتِ خداوندی اپنا سایہ کر لیتی ہے اور فرشتے اُن کے گرد گھیرا ڈال دیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ اُن کا ذکر فرماتا ہے ملائکہ مقربین کی محفل میں "

اِس حدیث سے ثابت ہوا کہ اِس حیاتِ دنیوی میں بھی ملائکہ کا نزول ہوتا ہے۔

آیات زیرِ درس میں آگے آنے والے جو الفاظ ہیں اُن میں آپ دیکھیں گے کہ ایک تو ہیں : وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّۃِ الَّتِیْ کُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ۝ خوشخبری حاصل کرو اُس جنت کی جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا۔ اِن الفاظ کی مناسبت ہے موت کے قریب نزولِ ملائکہ سے ——— جب ایک صاحب ایمان شخص اِس دنیا کو چھوڑ کر دوسرے عالم کی طرف جا رہا ہوتا ہے اُس وقت وہاں کے جو کارندے استقبال کے لئے آتے ہیں وہ انہیں بشارتیں دیتے ہیں کہ تمہاری کلفت کا وقت ختم ہوا۔ تمہاری محنت و مشقت کا وقت تمام ہوا۔ اب تمہارے لئے کسی خوف اور رنج کسی کلفت و محنت کی کوئی ضرورت نہیں ——— اب خوشخبری حاصل کرو اُس جنت کی جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا ——— یہ انداز اور یہ الفاظ جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا، اِس موقع سے زیادہ مناسبت رکھتے ہیں جب ایک بندۂ مومن کی اِس عالمِ فانی سے اُس عالمِ جاودانی کی طرف منتقلی ہو رہی ہوتی ہے جہاں مومنین صادقین کے لئے

اللہ تبارک وتعالیٰ نے فَرَوْحٌ وَّ رَیْحَانٌ وَّجَنَّةُ نَعِیْمٍ کا بندوبست فرمایا ہوا ہے۔
اگلی آیت میں الفاظ آتے ہیں نَحْنُ اَوْلِیٰٓؤُکُمْ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَفِی الْاٰخِرَةِ ط
"ہم ہیں تمہارے ساتھی اور دوست دنیا کی زندگی میں بھی اور آخرت میں"۔ یہ الفاظ
اِس کے ساتھ زیادہ مناسبت رکھتے ہیں کہ یہ حیاتِ دنیوی کے دوران کہے جائیں
کہ انسان خیر و شر کی کشمکش میں مبتلا ہو۔ اس وقت اس کو اس بات کی ضرورت
ہے کہ خیر کے لئے کوئی اس کی ہمت بندھانے والا ہو۔ کوئی اس کے دل کو نیکی پر جماؤ
عطا کرنے والا ہو کہ تم نیکی اور بھلائی پر مستقیم رہو۔ خیر کی راہ پر استقلال کے ساتھ
گامزن رہو۔ ہم ہیں تمہارے مددگار، ہم ہیں تمہارے پشت پناہ ـــــ پس میرے
نزدیک، اِن الفاظ کی کہ نَحْنُ اَوْلِیٰٓؤُکُمْ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَفِی الْاٰخِرَةِ زیادہ مناسبت
اِس سے ہے کہ یہ حیاتِ دنیوی کے دوران کہے جائیں اور اُن کا تعلق دورانِ حیاتِ دنیوی
میں ملائکہ کے نزول سے ہے۔ اس کے بعد فرمایا کہ وہ آخرت کیا ہے؟ اُس میں تمہارے
یہاں جنت کی نعمتوں کو دو حصّوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اِس اعتبار سے یہ مقام بہت اہم
ہے ـــــ ایک تو اس جنت میں وہ سب کچھ فراہم کر دیا گیا ہے جس کی خواہش تمہارے
نفس میں ہے۔ اللہ تعالیٰ تمہارا فاطر فطرت ہے۔ وہ جانتا ہے تمہاری مرغوبات کیا ہیں!
تمہیں کیا کیا چیزیں پسند ہیں۔ تمہارے نفس کے اندر کس کس چیز کی چاہت پائی
جاتی ہے ـــــ غور کیجئے! چونکہ یہ بڑی عقلی اور منطقی بات ہے کہ بندۂ مومن اِس دنیا
میں اپنے نفس کی مرضیات، خواہشات اور مرغوبات پر قدغنیں لگاتا ہے، پابندیاں
عائد کرتا ہے، نفس کے منہ زور گھوڑے کی لگام کھینچکر رکھتا ہے۔ وہ آخرت میں
اللہ تعالیٰ کے حضور جواب دہی کے لئے کھڑے ہونے سے لرزاں و ترساں رہتا ہے

وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى "وہ شخص جو اپنے رب کے حضور
النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ط کھڑے ہونے سے ڈرتا رہا اور
اس نے اپنی خواہشاتِ نفس کی باگیں تھام کر رکھیں۔ ان سے خود کو روکے رکھا"
تو ایسے شخص کو منطقی اور عقلی طور پر اس کا صلہ یہ ملنا چاہئے کہ جن چیزوں سے اُس نے

اللہ کی رضا کے لئے اپنے آپ کو روکے اور تھامے رکھا، باز رکھا۔ اسے اِن خواہشات کی بھرپور تسکین عطا کی جائے۔ چنانچہ جنت میں ابتدائی سامان تو وہ ہے وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَشْتَهِي أَنْفُسُكُمْ جو اشتہاء اور جس چیز کی بھی خواہش تمہارے نفس میں ہے اُن سب کا فراوانی کے ساتھ جنت میں تمہارے لئے اہتمام کر دیا گیا ہے۔

اَب اِس سے آگے بڑھ کر ایک درجہ ہے، وہ یہ ہے کہ ہر وہ چیز فراہم کر دی جائے گی جو تم طلب کرو گے: وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَدَّعُونَ ۝ یہاں یہ بات جان لیجئے کہ طلب کے درجے میں سب لوگ برابر نہیں ہیں۔ ہر ایک کی اپنے اپنے شعور اور آگہی کی سطح ہے۔ ہر ایک کا اپنا اپنا (Level of Consciousness) ہے۔ اِسی کے اعتبار سے ہر آدمی مانگے گا اور طلب کرے گا۔ ایسے لوگ بھی ہو سکتے ہیں جو عقل و شعور کے لحاظ سے زیادہ بلند نہ ہوں۔ انہیں وہی کچھ کافی ہو جائے جو اُن کے مرغوباتِ نفس کے مطابق وہاں فراوانی کے ساتھ مہیا کر دیا گیا ہو، وہی ان کے لئے کفائت کر جائے لیکن ایسے بھی اللہ کے بندے لازماً ہوں گے جن کو کوئی چیز تسکین نہ بخش سکے سوائے دیدارِ الٰہی کے ـــــ وہ صرف اللہ تبارک و تعالیٰ کے روئے انور کے دیدار کے طالب ہوں۔ اِس سے کمتر کوئی چیز بھی اُن کے لئے تسکین بخش نہ بن سکتی ہو۔ یہاں سے وہاں تک نہ معلوم کتنے درجات ہوں گے۔ لوگوں سے پوچھا جائے گا کہ تم کیا چاہتے ہو تو ہر شخص اپنی ذہنی سطح کے مطابق جواب دے گا ـــــ حال ہی میں میرے ایک دوست امریکہ جا رہے تھے، انہوں نے اپنی بچی سے سوال کیا، بیٹی میں تمہارے لئے وہاں سے کیا لاؤں؟ اُس نے کہا، میرے لئے ایک اچھی سی پنسل لے کر آئیے یہ اُس کے ذہن کی اپنی سطح ہے۔ اس کے ذہن کی محدود دنیا میں ابھی اِس سے اعلیٰ تر کسی چیز کا تصوّر موجود نہیں ہے۔ اس نے وہی کچھ مانگا جو اُس کے محدود فہم کے مطابق اعلیٰ درجہ کی چیز تھی۔ پس جنت میں اپنے شعور اور آگہی کے اعتبار سے جو شخص بھی جو کچھ چاہے گا وہ اس کے لئے فراہم کر دیا جائے گا۔ وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَدَّعُونَ ۝ یہ ہے اس جنت کی کیفیت ـــــ

آگے چلیئے! ایک اور درجہ بندی بھی ہے۔ یہ سب کچھ 'نُزُل' کے درجے میں ہوگا۔ عربی زبان میں نُزُل اس میزبانی کو کہتے ہیں جو مہمان کی آمد پر فوری طور پر کی جائے کوئی شخص جب کسی کے یہاں بطور مہمان آیا، سواری سے اترا ـــــ نزیل کہتے ہیں مہمان کو جو نازل ہوا ہے ـــــ تو اس کے نزول کے فوری وقت موسم کے اعتبار سے اس کی تواضع کے لئے جو ٹھنڈا گرم مشروب یا کوئی پھل اسے پیش کیا جاتا ہے تو یہ 'نزل' ہے۔ اس کے بعد پھر ضیافت کا اہتمام ہوتا ہے۔ مہمان کی حیثیت اور اپنے معیار کے مطابق ضیافت کا بندوبست ہوتا ہے۔ تو ایک نزل ہے، ایک ضیافت ہے۔ دونوں میں فرق ہے۔ یہاں فرمایا یہ سب کچھ بھی نُزُلًا مِّنْ غَفُوْرٍ رَّحِیْمٍ یہ بھی اس غفور رحیم کی طرف سے نزل کے درجے میں ہوگا باقی رہی ضیافت وہ اس نزل سے علیحدہ ہے اور وہ تمہارے تصور سے خارج اور ماورا رہے۔

جنّت میں اللہ عزّوجل نے اپنے بندوں کے لئے جو کچھ فراہم کیا ہے اُن تک اُن کا ذہن منتقل بھی نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ جنّت کی نعمتوں کے بارے میں ایک حدیث میں بڑے پیارے الفاظ آئے ہیں، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم نے ارشاد فرمایا:

مَالَا عَیْنٌ رَأَتْ وَلَا اُذُنٌ سَمِعَتْ وَمَا خَطَرَ عَلٰی قَلْبِ بَشَرٍ۔

"جنت کی نعمتیں وہ ہیں جنہیں نہ کسی آنکھ نے دیکھا۔ نہ کسی کان نے سُنا، نہ کبھی کسی انسان کے دل پر اس کا کوئی خیال و تصور وارد ہوا۔"

یہ ہے اصل ضیافت، یہ ہے وہ چیز جس کے فہم سے اور جس کے ادراک سے ہم بالکل قاصر ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے یہ سب کچھ جنّت میں اپنے نیکوکار بندوں کے لئے فراہم کیا ہے اُن بندوں کے لئے جنہوں نے کہا کہ یقیناً اللہ ہی ہمارا رب ہے پھر وہ اس پر جم گئے۔ اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا۔ ایسے بندوں کے لئے جنت میں پہلی چیز مہیا کی گئی ہے: وَلَکُمْ فِیْھَا مَا تَشْتَھِیْٓ اَنْفُسُکُمْ ـــــ دوسری چیز: وَلَکُمْ فِیْھَا مَا تَدَّعُوْنَ ـــــ پھر یہ دونوں چیزیں مل کر بھی نُزُلًا مِّنْ غَفُوْرٍ رَّحِیْمٍ ہے۔ یہ ابھی نُزُلٌ ہے۔ یہ ابھی ابتدائی میزبانی ہے۔

یہاں آخر میں اللہ تعالیٰ کی نہایت پیاری دو صفات بیان ہوئی ہیں۔ ان دونوں کا اس مضمون اور موضوع سے بڑا گہرا ربط و تعلق ہے جو اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ سے شروع ہوتا ہے۔ اس دنیا میں بڑے سے بڑا انسان بھی خطا اور نسیان سے بری نہیں ہے۔ کہیں نہ کہیں اور کبھی نہ کبھی بھول چوک ہو جاتی ہے۔ عربی کا مشہور مقولہ ہے: اَلْاِنْسَانُ مُرَکَّبٌ عَنِ الْخَطَاءِ وَ النِّسْیَانِ۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے اپنی صفاتِ مغفرت و رحمت کا ذکر فرمایا: نُزُلًا مِّنْ غَفُوْرٍ رَّحِیْمٍ۔ وہ اللہ جس کو تم نے حقیقی معنوں میں اپنا رب مانا ہے اور اس ماننے پر تم جمے رہو تو وہ اللہ تمہاری خطاؤں سے درگزر فرمانے والا ہے۔ وہ تمہاری غلطیوں سے چشم پوشی فرمائے گا۔ تم کو اپنی رحمت کی چادر سے ڈھانپ لے گا۔ عربی زبان میں غفر کا لفظ کسی چیز کو ڈھانپ لینے کیلئے آتا ہے۔ مغفر کہتے ہیں خَود کو جو لڑائی کے وقت سر پر پہن لیا جاتا ہے۔ وہ سر کو چھپا لیتا ہے اور تلوار کے وار سے سر کو بچاتا ہے۔ آج کل کی اصطلاح میں اسے (Helmet) کہا جاتا ہے۔ یہاں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کی چادر تمہاری لغزشوں اور خطاؤں کو ڈھانپ لے گی اور تم کو نہایت اچھا بدلہ ملے گا۔ اَحْسَنَ الَّذِیْ کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ۔ تم نے جو اچھے اور عمدہ کام کئے ہیں ان کے اعتبار سے تمہیں بدلہ ملے گا اور تمہارے درجات کا تعین اس سے ہوگا اور اللہ کی طرف سے تمہاری میزبانی اُن کے پیشِ نظر کی جائے گی۔ رہا لغزشوں خطاؤں اور بھول چوک کا معاملہ تو اللہ غفور بھی ہے رحیم بھی۔

اللہ تعالیٰ ہمیں بھی جنت کی نعمت عطا فرمائے۔ اپنی شانِ غفاری اور رحیمی سے ہماری خطاؤں سے درگزر فرمائے اور ہمیں بھی جنت کی نعمتوں میں سے کچھ حصہ عطا فرمائے ——— اب اگر آج کی گفتگو سے متعلق کوئی وضاحت مطلوب ہو تو پیش فرمائیں۔

سوال و جواب

سوال: ڈاکٹر صاحب! کیا مادّی اور روحانی ترقی ایک ساتھ ممکن ہے؟ اس کی وضاحت فرمائیں؟

جواب : اِن دونوں میں کوئی تضاد ایسا مروج نہیں ہے کہ یہ دونوں بیک وقت ممکن نہ ہوں ۔ اِس لئے کہ مادّہ بھی اللہ ہی کی مخلوق ہے اور روح بھی اللہ ہی کی مخلوق ہے اِن دونوں میں کوئی تضاد یا تناقض نہیں ہے ۔ اگرچہ وقتی طور پر دنیا میں ان کے تقاضے ایک دوسرے سے مختلف نظر آتے ہیں ۔ لیکن کمالِ آدمیت اسی کا نام ہے کہ دنیا میں مادی اور روحانی دونوں میں ہم آہنگی پیدا کی جائے اور انسان دونوں میں ایک ساتھ آگے بڑھے ۔ مادّے کی تسخیر کا مضمون قرآن حکیم کے جو اہم اور بنیادی مضامین ہیں' ان میں واضح کر دیا گیا ہے ۔ یہ ساری کائنات انسان کی تسخیر کے دائرہ میں ہے ۔ جیسے سورۂ جاثیہ میں فرمایا : وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا مِّنْهُ یہاں سَخَّرَ کے معنی یہ بھی ہیں کہ کائنات کی ہر چیز انسان کی خدمت میں لگی ہوئی ہے اور اس کا ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ کائنات کی ہر چیز انسان کے تسخیر کے دائرے کے اندر ہے ۔ اِس پہلو سے مادّی ترقی کا روحانی ترقی سے کوئی تضاد نہیں ہے

سوال : ڈاکٹر صاحب : خیر و شر کی کشمکش میں انسانی شکل میں کیا فرشتوں کا نزول ممکن ہے ؟ اگر ہے تو کوئی مثال بیان فرمائیے ؟

جواب : قومِ لوط کی تباہی کے لئے جن فرشتوں کو بھیجا گیا تھا وہ انسانی شکل میں تھے پھر جہاں وہ قومِ لوط کی تباہی کے لئے بھیجے گئے تھے وہاں وہ حضرت لوط علیہ السلام کی نصرت کے لئے بھی بھیجے گئے تھے ۔ اُن کی حفاظت بھی ان فرشتوں کے فرائض میں شامل تھی پھر یہی فرشتے انسانی شکل میں قوم لوط کی طرف جانے سے قبل انسانی شکل ہی میں ' حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مہمان بھی رہے تھے ۔ یہ پورا واقعہ قرآن میں بیان ہوا ہے پھر احادیث سے بھی ثابت ہے کہ فرشتے انسانی شکل میں نازل ہوتے ہیں ۔ حضرت جبریل علیہ السلام انسانی صورت میں متعدد بار نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں تشریف لائے تھے ۔ حدیثِ جبریل کو ام السنہ کہا جاتا ہے ۔ جیسے سورۂ فاتحہ کو ام القرآن' اِس حدیث میں ایک نو وارد کا آں حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر ۔ اسلام ' ایمان' احسان اور قیامت کے بارے میں سوالات کا جو ذکر ہے تو اسی حدیث میں صراحت

(باقی صـ ۶۴ پر)

مولانا اشرف علی تھانوی رح

پر تنقید کا جائزہ

از قلم مولانا سید شمس الحسن تھانوی
خطیب مسجد خضراء کراچی

شادی بیاہ کے ضمن میں محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی ایک اصلاحی تحریک و تحریر پر مولانا مفتی جمیل احمد صاحب تھانوی کی گرفت حد درجہ افسوسناک تھی کیونکہ حضرت مفتی صاحب نے محض مفروضات کو بنا کر یہ نقد و جرح کی تھی۔ ان کی تنقید پر ایک تنقیدی مضمون راولپنڈی کے معروف ہفت روزہ "حرمت" میں شائع ہوا جس کے لکھنے والے "حساس" کے قلم سے حضرت حکیم الامت تھانوی قدس سرہٗ اور ان کے حلقہ سے متعلق علماء کرام کے سلسلہ میں ایک آدھ جملہ ایسا نکل گیا جسے "شدت جذبات" کا شاخسانہ کہنا چاہیے۔ وہ مضمون "میثاق" کی اشاعت ستمبر ۱۹۸۵ء میں جوں کا توں نقل کر دیا گیا، جس پر ہمارے محترم کرم فرما مولانا شمس الحسن تھانوی خطیب مسجد خضراء کراچی نے تاسف ہی نہیں غصہ کا بھی اظہار فرمایا ہے اور حضرت تھانوی قدس سرہٗ اور ان حلقہ کے علماء کرام سے متعلق ایک تاریخی نوعیت کا دلچسپ مضمون ارسال کیا ہے، جسے ہم بصد شکریہ شائع کر رہے ہیں۔

اللہ تعالیٰ گواہ ہے کہ ہمارے دل میں حضرات علماء کرام سے متعلق بڑی قدر ہے، ہم انہیں دین کا خادم سمجھتے اور ان کا احترام کرتے ہیں اور ان سے یہ خواہش و توقع رکھتے ہیں کہ وہ جذبہ نصح و خیر خواہی کے تحت ہماری غلطیوں کے سلسلہ میں ہمیں توجہ دلائیں۔ جس پر ہم ان کے شکر گزار ہوں گے ـــــ لیکن حضرت مفتی جمیل احمد صاحب کی طرح مفروضات پر کوئی عمارت کھڑی کرنا کسی طرح مناسب نہیں اور یہ بات علم و تقویٰ کے معیار سے کسی طرح میل نہیں کھاتی۔

مولانا شمس الحسن اگر اپنے اس دلچسپ اور معلومات افزا مضمون میں متعلقہ مسئلہ "شادی بیاہ کی اصلاحی تحریک" سے متعلق بھی چند سطور سپردِ قلم فرما دیتے تو خوب ہوتا لیکن ایسا نہیں ہوا ـــــ اس کے باوجود یہ مضمون لائق مطالعہ ہے۔ اس لیے بارِ دیگر اس کا شکریہ ادا کرنا ہمارا فرض ہے۔

وضاحت: یہ ادارتی نوٹ ڈاکٹر اسرار احمد کے گذشتہ ماہ کے "تذکرہ و تبصرہ" کی تحریر سے قبل لکھا گیا تھا۔ (ادارہ)

تخریبِ محبت آساں ہے تعمیرِ محبت مشکل ہے
تم آگ لگانا سیکھ گئے تم آگ بجھانا کیا جانو

میثاق میں ستمبر ۸۵ء کے شمارہ میں ایک تنقیدی مضمون حسّاس کے قلم سے نکلا ہے جو صفحہ ۹۵ سے صفحہ ۷۰ تک تیرہ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ اس مضمون میں جناب مفتی جمیل احمد صاحب کے ایک تنقیدی مضمون پر تنقید کی گئی ہے۔ جہاں تک نفسِ مضمون یا نفسِ تنقید کا تعلق ہے اس کے بارے میں ہمیں کچھ کہنا نہیں ہے لیکن قابلِ افسوس امر یہ ہے کہ اس مضمون میں انہوں نے ضمناً غیر ضروری طور پر حضرت تھانویؒ کو بھی تنقید کا نشانہ بنایا ہے چھوٹا منہ بڑی بات۔ یہی وہ بات ہے جس کا نوٹس ہم اس تحریر میں لے رہے ہیں۔ وہ اقتباس یہ ہے :

"دیوبندی تعلیمی اسکول میں مولانا اشرف علی ایک ایسے بزرگ تھے جو تحریکات ملّیہ سے نہ صرف الگ تھلگ رہے اور محتاط روش اختیار کی بلکہ انہوں نے بسا اوقات تلخی کا مظاہرہ کیا اور اتفاق یہ ہے کہ ان کے متعلقین کا قریب قریب ہمیشہ یہ رویّہ رہا۔ ان کے خدام میں مولانا خیر محمد جالندھری البتہ ایسے بزرگ تھے جنہوں نے جالندھر میں مدرسہ خیر المدارس کی داغ بیل ڈالی ان کے رویہ میں کمال درجہ توازن و اعتدال تھا۔ وہ واقعۃً ایسے بزرگ تھے جنہوں نے ہمیشہ جوڑنے کی فکر کی حتی کہ اسی فکر میں وہ دنیا سے رخصت ہوئے "

ناظرین آپ نے دیکھا کہ اس اقتباس میں نہ صرف حضرت مولانا تھانوی بلکہ ان کی پوری جماعت اور حلقۂ احباب حسّاس کی تنقید کا ہدف بنا ہوا نظر آ رہا ہے ؎

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانہ میں
تڑپے ہے مرغ قبلہ نما آشیانہ میں

حیرت ہے حسّاس کا تنقیدی مضمون حضرت تھانوی اور ان کی جماعت سے تعرض کئے بغیر بھی پورا ہو رہا تھا پھر نہ معلوم مفتی صاحب پر تنقید کے ضمن میں پوری جماعت کو کوسنے کی کیا ضرورت پیش آئی تھی۔

ہم احسّاس سے پوچھتے ہیں کہ اگر حسّاس کو کسی مسئلہ میں ایک رائے رکھنے کا حق ہے اور وہ اسے تلخی کا مظاہرہ کرنا نہیں سمجھتے تو حضرت مولانا کے اختلاف رائے کو وہ تلخی کا مظاہرہ کرنے سے تعبیر کرنے میں کیونکر حق بجانب ہیں۔ کیا وہ تلخی کی آڑ میں حریتِ فکر اور آزادیٔ رائے کے بنیادی حق کو سلب کرنا چاہتے ہیں۔

دراصل حسّاس صاحب نے اختلاف رائے اور تلخی کا مظاہرہ کرنے کے علمی فرق کو ملحوظ نہیں رکھا۔

اختلاف رائے اگر حدود شریعت کے اندر ہو اور نیک نیتی سے ہو تو وہ نہ صرف جائز بلکہ مستحسن اور بعض اوقات واجب ہے۔ اسی واسطے فرمایا گیا : اختلاف امتی رحمۃ

اختلاف رائے سے علم کی راہیں کھلتی ہیں عقل میں وسعتیں پیدا ہوتی ہیں۔ فکر و نظر کی تربیت ہوتی ہے۔ لیکن اگر وہی اختلاف رائے خلاف شریعت ہو یا ذاتی مفاد اور خود غرضی اور تعلّی اور تفاخر وغیرہ کی بنا پر ہو تو اختلاف رائے مذموم ہے۔

اور اسی کے بارے میں کہا جائے گا کہ فلاں شخص نے تلخی کا مظاہرہ کیا۔ فقہی افکار و آراء میں فاتحہ خلف الامام کا مسئلہ ایک معرکۃ الآراء مسئلہ ہے کہ امام ابوحنیفہ کے نزدیک کلیتہً منع ہے۔ پھر جس دن امام صاحب کا انتقال ہوا وہی دن امام شافعی کا یوم ولادت ہے اور آگے چل کر وہ مجتہد ہوئے اور انہوں نے فاتحہ خلف الامام کے وجوب کا فتویٰ دیا۔

تو کیا اس کو اور اس جیسے دوسرے فقہی اختلافات کو کوئی شخص یہ کہے گا کہ امام شافعی نے بسا اوقات تلخی کا مظاہرہ کیا؟

تلخی کا مظاہرہ کیا یا اختلاف امتی رحمۃ کا مظاہرہ کیا۔

رہا یہ کہ حضرت تھانویؒ کا اختلاف رائے کس زمرے میں آتا ہے تو اس کے فیصلہ کے لئے حساس صاحب کی رائے کو زحمت دینے کی ضرورت نہیں بلکہ اس کے لئے ان اعاظم روزگار کی طرف رجوع کیا جائے گا جو حضرت تھانویؒ کے معاصرین ہیں جن کے قلوب و اذہان کو اللہ تعالیٰ نے مخصوص نور بصیرت سے نوازا تھا جو صحیح معنے میں "اتقوا فراسۃ المؤمن فانہ ینظر بنور اللّٰہ" کے مصداق تھے۔

حضرت تھانوی کا اختلاف رائے کہیں قبرستان میں یا کسی سنسان جنگل میں نہیں تھا بلکہ وہ تمام واقعات علی رؤس الاشہاد ان اکابر رجال کی موجودگی میں ہوئے تھے کہ ان جیسے اقران و امثال چشم فلک نے کم دیکھے ہوں گے۔ پھر اس طرح کی تنقید ان حضرات کے ریکارڈ میں کہیں کیوں نہیں ملتی۔

کیا وہ حضرات حق کے معاملہ میں کسی رو رعایت کے قائل تھے۔ کیا دین کے معاملہ میں انہوں نے کبھی مداہنت برتی تھی۔ کیا وہ کسی سے ڈرنے والے تھے جن اعاظم رجال نے انگریز کی جابر و قاہر سلطنت کو پر کاہ کے برابر نہ سمجھا اور بالآخر اس کے پرخچے اڑا کر رکھ دئے، کیا ان کو دنیا کی کوئی ترغیبی یا ترہیبی طاقت اظہار حق سے روک سکتی تھی؟

جی میں ہی کچھ نہیں ہے ہمارے وگرنہ ہم   سر جائے یا رہے نہ رہیں پر کہے بغیر

حضرت تھانوی کے طرز عمل کا جو تجزیہ حساس صاحب آج نصف صدی گزر جانے کے بعد کر رہے ہیں یہ تجزیہ اس وقت بھی کوئی نہ کر سکا، جبکہ دیوبند میں آفتاب علم نصف النہار پر تھا۔ وہ روشن گہر حضرت شیخ الہند جن کے نور بصیرت کے آگے آفتاب کی روشنی ماند ہے۔ وہ شیخ الاسلام حضرت حسین احمد جن کے آگے علم پانی بھرتا ہے۔ وہ جبال علم حضرت خلیل احمد شارح ابوداؤد اور شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد شارح بخاری و مسلم جن پر دانائی و زیرکی کو ناز تھا اور فقیہہ عصر حضرت مفتی کفایت اللہ مفتی اعظم ہند اور دیگر اکابر و اعاظم رجال جو اپنی خداداد مؤمنانہ فراست سے ایک نظر میں اسرار درون پردہ کو بھانپ جانے والے تھے۔

اک نظر میں طائر گم گشتہ کو   بھانپ لیں ہم ہیئت پرواز سے

لیکن حضرت تھانویؒ کی سیاسی زندگی کی جو تشریح حساس صاحب نے کی وہ نہ شارح ابوداؤد کر سکے نہ شارح بخاری و مسلم۔

کیا حساس صاحب کے احساسات ان حضرات کے قلبی ادراکات سے بھی زیادہ عمیق اور دور رس ہیں۔ کیا سارا نور فراست حساس ہی کی چشم بصیرت میں سما گیا ہے۔

افسوس ہے حساس صاحب کے احساسات بزعم خویش جتنا حضرت تھانوی کا مقام معلوم کرنے میں تیز نکلے اتنی ہی ان کی حس خود اپنا مقام معلوم کرنے میں کند رہی۔ ہر شخص کا یہ منصب نہیں کہ ہر شخص پر تنقید کرے۔ ایاز قدر خود بشناس

ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی — اب آبروئے شیوۂ اہل نظر گئی!

اصاغر کی عقل و فہم کی سلامتی اسی میں ہے کہ وہ اپنی رائے پر اعتماد کرنے سے پہلے اکابر کی رائے پر اعتماد کرنا سیکھیں۔ عقلاء نے کہا ہے العجب آفۃ اللب۔ وقال تعالیٰ واتبع سبیل من اناب الیّ

جس شخص کو امت حکیم الامت کے لقب سے یاد کرتی ہو جس کو ملت اسلامیہ نے مجدد الملۃ کا خطاب دیا ہو اس پر حضرت حساس کے یہ ریمارکس فیا للعجب!

کاش حساس صاحب نے حضرت تھانوی کے بارے میں قطب وقت حضرت مولانا حضرت خیر محمد صاحب ہی کی رائے کو مقدم سمجھا ہوتا جن کا وہ بڑا احترام کرتے ہیں اور بجا طور پر ان کی مدح میں رطب اللسان ہیں

بظاہر یہ معمولی سی بات نظر آتی ہے لیکن اس کے عواقب اور عوامض پر اگر غور کیا جائے تو اس کے نتائج دور رس ہو سکتے ہیں۔

کاش حساس صاحب یہ سوچتے کہ یہ ریمارکس اگر مخالف معاند کے ہاتھ لگ گئے تو وہ ان کا کتنا غلط استعمال کریگا۔

؎ غیر پھرتا ہے ترے خط کو لئے یوں کہ اگر — کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے تو چھپائے نہ بنے

ان معمولی معمولی باتوں سے اگر صرف نظر کیا جائے تو یہی چھوٹی چھوٹی چنگاریاں آگے چل کر شعلۂ جوالہ بن جاتی ہیں۔

یہ بات محتاجِ دلیل نہیں کہ حضرت تھانوی اور علمائے دیوبند دو متحارب گروپ نہیں ہیں بلکہ متجانس عناصر اور ایک جان دو قالب ہیں۔ کسی ایک کے متعلق بدظنی کا مواد فراہم کرنا پوری جماعت سے بدظنی پیدا کرنے کے مترادف ہے۔ آنے والی نسلوں کا اگر علمائے دیوبند کے اوپر سے اعتماد اٹھ گیا تو اس کے بعد سوائے بدعاتِ قبیحہ اور رسوماتِ شرکیہ کے اور ربانی کیا رہ جاتا ہے۔

اس قسم کی غیر واقعی باتیں جب تاریخ میں ثبت ہو جاتی ہیں تو تاریخ مسخ ہو جاتی ہے اور آنے والی نسلوں کیلئے وہ ایک مسئلہ بن جاتا ہے اور صحیح فیصلہ نہیں ہو پاتا کہ اصل صورت حال کیا تھی۔ مثلاً حساس صاحب کی تعبیر و تشریح سے معاندین یہ پروپیگنڈہ کر سکتے ہیں کہ تعمیر پاکستان میں علمائے دیوبند کا کردار منفی رہا ہے چنانچہ حضرت تھانوی جو علمائے دیوبند میں ایک سربرآوردہ شخص ہیں وہ تو تحریکاتِ ملیہ سے الگ تھلگ رہتے تھے اور ان کو اگر اصلی روپ میں دیکھنا ہو تو حساس کے آئینے میں دیکھو کہ آئینہ کسی غیر کا نہیں ان ہی کا خود ساختہ ہے۔

لیکن بعض آئینے ایسے ہوتے ہیں کہ ان میں صورت الٹی نظر آتی ہے۔ بہر حال افسوس ہے

مصر آنچہ تو باخویشتن کردی کس نہ کرد

اسی طرح کی غیر محتاط رائے زنی جب تاریخِ اسلام میں درج ہوگئی تو وہ تاریخ کا ایک جزو بن گئی اور اس سے غلط قسم کی نئی نئی فرقہ بندیوں نے جنم لیا اور اسی نوع کے بے سرو پا ریکارکس کے سہارے آج یزید ' حضرت یزید اور رحمۃ اللہ علیہ بنا ہوا ہے۔

لطیفہ

ایک مرتبہ حضرت تھانوی نے فرمایا کہ مثنوی میں جو قصہ پیرچنگی کا بیان ہوا ہے اس کی توجیہہ یہ ہے کہ جہاں تک اس کا گانے بجانے کا شغل تھا وہ تو تھا غیر مشروع لیکن اس کے ساتھ ہی فضائل اخلاق میں سے وہ اخلاص کی منفیت سے بھی بہرہ مند تھا تو اللہ تعالیٰ نے اس کے اخلاص کے توسل سے اس کے اس نامشروع عمل کو معاف کر دیا ۔

اس پر حضرت مولانا خیر محمد صاحب نے سوال کیا کہ حضرت اس طرح تو پھر ساری بدعات جائز ہو جاتی ہیں۔ اس کے جواب میں حضرت نے فرمایا کہ یہ فتویٰ بیان نہیں ہو رہا ہے بلکہ حق تعالیٰ کا برتاؤ جو اس کے ساتھ ہوا اس کا بیان ہو رہا ہے۔ یہ اسرار ہیں ضبطِ تحریر میں نہ لائے جائیں کہیں اشرار تک نہ پہنچ جائیں۔

میرے عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ جو "اسرار" حضرت تھانوی کے متعلق حسّاس صاحب پر منکشف ہوئے ان کا اسرار ہی مصلحت تھا کہ وہ اسرار کہیں اشرار تک نہ پہنچ جائیں اور وہ اس سے غلط فائدہ اٹھائیں اور پھر ایسا اصرار کریں۔

پھر اگر یہ انکشاف کچھ حقیقت ہوتا تو ہمیں کچھ اعتراض نہ ہوتا ہم سمجھتے کہ حسّاس نے ایک حقیقت کو آشکارا کیا مگر حقیقت یہ ہے کہ ع

خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد

رہا یہ سوال کہ میثاق کے ابھی حال کے کسی شمارہ میں مولانا سعید احمد اکبر آبادی کا انتقال سے کچھ پہلے جو انٹرویو آیا ہے اس میں انہوں نے کہا ہے کہ مولانا تھانوی بھی بعض علماء کے نزدیک مشتبہ تھے۔

تو اگر آپ ان کے اس مقولہ کو سیاق و سباق میں دیکھیں تو ان کے کہنے کا مطلب صاف ہے کہ جس طرح بعض لوگوں کا مولانا تھانوی کی شخصیت کو مشتبہ قرار دینا کوئی وزن نہیں رکھتا اسی طرح یہ بات کہ ڈاکٹر اسرار احمد کی شخصیت مشتبہ ہے' ناقابلِ التفات ہے۔

حسّاس صاحب نے ایک بات اور فرمائی کہ مولانا تھانوی تحریکاتِ ملیہ سے الگ تھلگ رہے۔

ع اس سادگی پہ کون نہ مرجائے اے خدا

اگر ہم ۱۸۵۷ء سے لے کر ۱۹۴۷ء تک نوّے سالہ انگریز کے دورِ حکومت کا جائزہ لیں تو اس پوری نوّے سالہ

تاریخ کو دو لفظوں میں سمیٹا جا سکتا ہے (۱) آزادئ وطن (۲) تعمیر پاکستان ــــ اور یہ دونوں لفظ دو جمعیتوں کا ہدف ہیں (۱) جمعیتہ علمائے ہند (۲) جمعیتہ علمائے اسلام جہاں تک آزادی وطن کا تعلق ہے یہ کام سرانجام دیا جمعیت علمائے ہند نے بشمول کانگریس۔ چنانچہ دیوبند کے صد سالہ جشن کے موقع پر اندرا نے بھی اعتراف کیا کہ تحریک آزادی میں علمائے دیوبند کا بڑا حصّہ ہے۔

والفضل ما شهدت به الاعداء

اور جہاں تک تعمیر پاکستان کا تعلق ہے یہ کام سرانجام دیا جمعیت علمائے اسلام نے بشمول مسلم لیگ ــــ ہیں دونوں طرف علماءِ دیوبند۔ فرق یہ ہے کہ جمعیت علماء ہند گروپ ہے حضرت شیخ الہند کا اور جمعیت علمائے اسلام یہ گویا تھانوی گروپ ہے۔

اور جہاں تک مولانا ابوالکلام آزاد کا تعلق ہے تو ان کا شمار بھی تحریک آزادی میں علماء کے اوّل الذکر گروپ کے ساتھ ہوگا ؎

ہم مشرب و ہم مسلک و ہم راز ہے میرا
غالب کو بُرا کیوں کہو اچھا مرے آگے

اگر انگریز ملک سے نہ نکلتا تو پاکستان بننے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ انگریز نکلا تو پاکستان کا تصوّر بھی عملی صورت میں نمودار ہوا۔ تو گویا انگریز کا نکلنا پاکستان کے لئے بمنزلہ بنیاد کے ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ پاکستان کی بنیاد تو جمعیت علمائے ہند کے ہاتھوں فراہم ہوئی اور اس بنیاد پر جو عمارت بنی یعنی پاکستان تو اس کا معمار جمعیت علماء اسلام ہے۔

اگر آپ کہیں کہ پاکستان تو قائد اعظم نے بنایا تو مجھے کب اس سے انکار ہے۔ مگر قائد اعظم اس کام کو پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچا سکتے تھے اگر جمعیت علماء اسلام اس میں ان کی ممد و معاون نہ بنتی۔ اور یہ ایک ایسی واضح حقیقت ہے کہ اس کا انکار صرف وہی شخص کر سکتا ہے جو انتہا درجہ کا ضدی اور ہٹ دھرم ہو۔

یہ بات ہر شخص جانتا ہے کہ مسلم لیگ نوابوں، جاگیرداروں اور ٹوڈیوں کی جماعت تھی اور یہی وجہ ہے کہ عوام اس جماعت کو نہایت شک و شبہ کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ قائد اعظم کو صرف علی گڑھ طبقہ کی حمایت حاصل تھی عوام کا رجحان جمعیت علمائے ہند کی طرف تھا تا آنکہ حضرت تھانوی کا فتویٰ شائع ہوا جس میں حضرت نے تحریر کیا ہیں کانگریس میں مسلمانوں کی شمولیت کو مذہباً مہلک سمجھتا ہوں اور متعدد ہدایات کے ساتھ مسلمانوں کو مسلم لیگ میں شمولیت کا مشورہ دیا۔

ناظرین آپ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ اس فتویٰ سے ملک کے کروڑوں افراد کی رائے بدل گئی اور حضرت مولانا شبیر احمدؒ جو ہنوز در رطۂ غور و فکر میں تھے ان کی رائے بھی یقین محکم میں بدل گئی۔
(شاید حساس صاحب اسی کو کہتے ہوں کہ بسا اوقات تلخی کا مظاہرہ کیا)

معلوم ہونا چاہیئے کہ حضرت مولانا شبیر احمد صاحب حضرت تھانوی سے بیعت تھے لیکن تحریک خلافت کے زمانہ میں اس میں رخنہ پڑ گیا تھا لیکن بعد میں مذکورہ فتوے کے شائع ہونے سے قبل ہی سے تعلقات استوار ہو گئے تھے اور پہلے کی طرح عقیدت اور اخلاص پیدا ہو گیا تھا۔ چنانچہ حضرت مولانا شبیر احمد صاحب طویل سیاسی خموشی کے بعد آندھی اور طوفان بن کر اٹھے اور پاکستان کی حمایت میں ان کی جادو بھری تقریروں نے ملک میں ہلچل مچادی۔ صوبہ سرحد میں دیوبند کے بڑے بڑے کانگریسی کے حامی علماء گوشہ نشین ہو گئے لوگوں نے پوچھا کہ حضرت کیوں خاموشی اختیار کر لی۔ جواب دیا کہ اب استاد میدان میں نکل آیا ہے۔

لاہور کے اسلامیہ کالج کے میدان میں پاکستان کی حمایت میں حضرت مولانا شبیر احمد کی تقریر ہو رہی ہے رات کے بارہ بج رہے ہیں۔ خضر حیات کی حکومت کا دور ہے میدان سامعین سے کھچا کھچ بھرا ہوا ہے ــــ تل دھرنے کو جگہ نہیں۔ خطرات سروں پر منڈلا رہے ہیں۔ دوران تقریر خطرات کو چیلنج کرتے ہوئے مولانا نے فرمایا اگر مجھ کو گدھے پر الٹا سوار کیا جائے اور میرا منہ کالا کیا جائے اور اسی حالت میں شہر میں گشت کرایا جائے اور لڑکوں کی فوج پیچھے پیچھے تالیاں بجاتی چلے تو میں اس کو اللہ کے راستہ میں ایک معمولی قربانی تصور کروں گا۔

ایسا ہوا جیسے مجمع میں آگ لگ گئی ہو، آنکھیں اشکبار تھیں اور دل بے قابو ہو رہے تھے۔

اس کے ساتھ ہی مولانا کی تقریر اتنی مبرہن اور مدلل تھی کہ حریف کے لئے جواب کی گنجائش نہیں چھوڑی۔

بعد میں بڑے بڑے علوم جدیدہ کے ماہرین کو یہ کہتے سنا گیا کہ ہمیں معلوم نہیں تھا کہ علماء میں بھی ایسے بالغ نظر لوگ موجود ہیں۔

خلاصہ یہ کہ مولانا شبیر احمد صاحب کی سیاست تحریک آزادی میں حضرت شیخ الہند کی سیاست کے تابع رہی تو تعمیر پاکستان کے وقت ان کی سیاست حضرت تھانوی کی سیاست کے تابع تھی۔ سرحد کے ریفرنڈم میں کامیابی آپ ہی کی مساعی جمیلہ کی مرہون منت ہے۔ جسطرح سلہٹ ریفرنڈم کی کامیابی مولانا ظفر احمد عثمانی کی جد وجہد اور کوششوں کا نتیجہ ہے۔

اگر قائداعظم کو بروقت علماء کی یہ تائید وحمایت حاصل نہ ہوئی ہوتی تو میں پوچھتا ہوں مسلم لیگ کبھی کامیاب ہو سکتی تھی اور پاکستان دنیا کے نقشہ پر کبھی ابھر سکتا تھا؟

حضرت تھانوی کے حکم سے زعمائے لیگ کا ایک جلسہ خاص تھانہ بھون میں کرایا گیا جس کا تمام انتظام حضرت نے جناب مولانا شبیر احمد صاحب کے سپرد کر رکھا تھا اس میں گو حضرت نے خود شرکت نہیں کی مگر وہ جلسہ حضرت کے حکم اور ایماء کے بموجب ہوا اور اس میں حضرت کی تحریر کردہ ہدایات کو پڑھکر سنایا گیا۔

اصل میں لیگ کی تائید وحمایت اور اصلاح کا کام حضرت نے ایک جماعت کے سپرد کر رکھا تھا جن میں سے چند حضرات کے نام یہ ہیں مولانا ظفر احمد عثمانی، مولانا شبیر احمد صاحب، مفتی عبدالکریم صاحب گمتھلوی وغیرہ۔

متعدد بار حضرت تھانوی کی مراسلت اور مکاتبت ہوئی ہے قائداعظم مرحوم سے انہی حضرات کے توسط سے۔

اور اسی کی بدولت قائد اعظم اس درجہ حضرت تھانوی سے متاثر ہو گئے تھے کہ جب ایک موقع پر کسی وفد نے قائد اعظم سے ملاقات کی اور علماء کا ذکر آیا تو قائد اعظم نے کہا کہ آپ کو معلوم ہے اس وقت ملک میں سب سے بڑا عالم کون ہے؟ اور یہ کہہ کر فائل میں سے ایک خط نکال کر ان کو دکھایا۔ اور یہ خط تھا حضرت تھانوی کا۔

دہلی میں جب مسلم لیگ نے اجلاسِ عام منعقد کیا تو اس میں حضرت تھانوی کو بھی دعوت شرکت دی گئی۔ لیکن حضرت تھانوی اس سے کافی عرصہ پہلے سے بوجہ آلام و آزار جسمانی سفر سے معذوری کا اعلان کر چکے تھے یہانتک کہ تبلیغی دورے بھی ترک کر دیئے تھے۔ اس لئے خود تو شرکت نہیں کر سکے لیکن اس قسم کے اجتماعات میں آپ برابر اپنی ہدایات اور تعلیمات کے ساتھ سفارتیں بھیجتے رہے۔

مسلم لیگ کے اجلاس پٹنہ سیشن میں مولانا ظفر احمد تھانوی نے حضرت تھانوی کا تاریخی پیغام پڑھ کر سنایا۔

لیکن حسّاس صاحب کا تجزیہ یہ ہے کہ تحریکات ملّیہ سے الگ تھلگ رہے ؎

منصفی دنیا سے ساری اٹھ گئی　　　اے بتو! ایماندا ری اٹھ گئی

ملک کی کون سی دینی سیاسی تحریک ایسی ہے جس میں حضرت تھانوی سیاسی بے بصیرتی کی بنا پر الگ تھلگ رہے ہوں۔ اس کی نشاندہی تو کی جائے۔ خود حضرت فرماتے ہیں:

"مسلمانوں کی موجودہ حالت اور اس کے نتائج کا تصوّر اگر کھانے سے پہلے آجاتا ہے تو بھوک اڑ جاتی ہے اور سونے سے پہلے آجاتا ہے تو نیند اڑ جاتی ہے"

؎ اے فاختہ پرواز کناں بر سر سروے

درد دلِ مرغانِ گرفتار چہ دانی!

ہم حسّاس صاحب سے پوچھتے ہیں کہ آخر وہ کون سی تحریکات ملّیہ ہیں جن میں حضرت تھانوی نے بالواسطہ یا بلاواسطہ حصہ نہ لیا۔

شارِ دابل آیا تو حضرت تھانوی نے شارِ دلائل کے نام سے اس کی تردید شائع کی۔ ملک میں پردہ کا مسئلہ اٹھا تو حضرت تھانوی نے القول الصواب فی مسئلۃ الحجاب لکھ کر ملک و قوم کی شرعی رہنمائی کا فرض ادا کیا اور صرف حضرت تھانوی ہی نہیں بلکہ حضرت کی جماعت نے بھی ہر تحریکِ ملّی کے موقع پر کارہائے نمایاں انجام دیئے خود اسی پردہ کے مسئلہ پر حضرت خواجہ عزیز الحسن مجذوب غوریؒ نے نمکدانِ ظرافت کے نام سے تقریباً پونے چار سو اشعار ایک ہی قافیہ اور ردیف میں کہہ کر حریف کا ناطقہ تنگ کر دیا۔ انہی خواجہ صاحب نے مسلم لیگ کی حمایت میں "مسلم خوابیدہ اٹھ گرم تماشا تو بھی ہو" مسدس کا پورا کتابچہ منظوم کیا۔ اسی طرح اپنے منظوم کلام کے ذریعہ سیدھے سادے سادہ لوح مسلمانوں کو متعصب ہندؤوں کے تعصب سے آگاہ کیا۔

مولانا احتشام الحق تھانوی مرحوم نے بائیس دستوری نکات پر ہر مکتب فکر کے اہم علماء کو جمع کر کے

ہمیشہ کے لئے ان لوگوں کا منہ بند کر دیا جو یہ کہتے تھے کہ علماء کسی مسئلہ پر متفق ہو ہی نہیں سکتے۔

ایوب کے وقت میں جب چاند کے مسئلہ میں مسئلہ شرعی کو مسخ کرنے کا حکومت نے فیصلہ کیا تھا تو اس وقت جو سب سے آگے سینہ سپر تھا وہ کس جماعت کا آدمی تھا۔

تعجب ہے حساس صاحب نے اس قسم کے تمام واقعات وحقائق سے کیوں اغماض برتا۔

شاید حساس صاحب کہیں کہ حضرت تھانوی تحریک خلافت کے زمانہ میں الگ تھلگ رہے۔ تو اگر واقعی حساس صاحب کا اشارہ اسی طرف ہے تو ہم جواب میں عرض کریں گے کہ یہاں بھی حساس صاحب کے قلم کو وہی لغزش ہوئی ہے جس کا ذکر ابھی کچھ پہلے ہو چکا ہے۔

کسی تحریک سے الگ تھلگ رہنا دو وجہ سے ہوسکتا ہے۔ اگر وہ الگ تھلگ رہنا عافیت کوشی اور راحت طلبی یا سیاسی بے بصیرتی کی بنا پر ہو تو واقعی مذموم ہے لیکن اگر مجتہد بر بنائے اجتہاد اور غور وفکر الگ تھلگ رہنے کا فیصلہ کرتا ہے تو یہ الگ تھلگ رہنا مذموم نہیں ہے بلکہ یہ اس کی اجتہادی رائے ہے اور اس کو مقام مذمت میں ذکر نہیں کیا جاسکتا۔ معلوم ہوتا ہے حساس صاحب نے اس علمی فرق کو ملحوظ نہیں رکھا۔

یہ بالکل علیحدہ بات ہے کہ کس کی رائے صحیح تھی اور کس کی رائے غلط تھی اور نہ یہ چیز اس وقت زیر بحث ہے لیکن اس میں دو رائے نہیں ہوسکتیں کہ اگر کسی کی رائے غلط بھی تھی تو اس کے لئے بھی عند اللہ ایک اجر ہے۔

حدیث ترمذی ہے: المجتهد قد يخطی وقد يصيب فان اصاب فلهٗ اجران وان اخطأ فلهٗ اجر واحد (او کما قال)

پھر جب اس کے لئے ایک اجر کا وعدہ ہے تو اس کو مقام مذمت میں ذکر کرنے کے کیا معنی!

تحریک خلافت کے زمانہ میں حضرت مفتی کفایت اللہ اور حضرت تھانوی کا ایک مکالمہ نقل کیا جاتا ہے جس سے اندازہ ہوگا کہ حضرت تھانوی کی تحریک خلافت سے علیحدگی غفلت اور غیر شعوری طور پر نہ تھی بلکہ وہ حضرت کی اجتہادی رائے تھی۔

مفتی صاحب! حضرت اگر آپ اٹھ کھڑے ہوں تو سب اٹھ کھڑے ہوں

حضرت تھانوی! مفتی صاحب آپ نے یہ بات سوچ کر کہی ہے یا بغیر سوچے کہدی؟

مفتی صاحب! حضرت سوچ کر کہی ہے۔

حضرت تھانوی! اچھا ایک بار اور سوچ لیجئے!

تھوڑی دیر خاموشی رہی اس کے بعد حضرت نے فرمایا:

حضرت تھانوی! مفتی صاحب آپ نے سوچا۔ اب آپ کی کیا رائے ہے!

مفتی صاحب! حضرت میری وہی رائے ہے۔

حضرت تھانوی! مفتی صاحب آپ ایک بار اور غور کرلیں

مفتی صاحب نے تیسری بار بھی وہی بات دہرائی کہ حضرت اگر آپ اٹھ کھڑے ہوں تو سب اٹھ کھڑے ہوں۔
حضرت تھانوی نے فرمایا کہ مفتی صاحب آپ یہ بتائیے کہ اگر واقعی مجھے عوام میں اتنا قبول عام حاصل ہے کہ اگر میں اٹھ کھڑا ہوں تو سب اٹھ کھڑے ہوں تو یہ بتائیے کہ اب جو میں بیٹھا ہوں تو سب کیوں نہیں بیٹھ جاتے۔
اس کے بعد حضرت نے فرمایا! مفتی صاحب بات یہ ہے کہ عوام علماء کا اتباع کرنا نہیں چاہتے بلکہ علماء سے اپنا اتباع کرانا چاہتے ہیں۔ اگر میں بھی ادھر ہی کو چلوں جدھر کو سب چل رہے ہیں تو میں مقبول و ممدوح ہوں ورنہ مطرود و مطرود ح۔
اس مکالمہ کا مطالعہ کرنے کے بعد ہر شخص بآسانی اس نتیجہ پر پہنچ سکتا ہے کہ حضرت کی علیحدگی سیاسی بے بصیرتی کی بنا پر نہیں تھی بلکہ وہ اجتہادی فیصلہ تھا۔
حسّاس صاحب نے ایک بات یہ فرمائی کہ حضرت تھانوی نے محتاط روش اختیار کی'
اگر اس سے ان کا اشارہ اس طرف ہے کہ جیل نہیں گئے تو جیل تو قائد اعظم اور علامہ اقبال بھی نہیں گئے اور اگر اس سے مراد ان کی یہ ہے کہ عافیت کوشی مطمح نظر تھا تو شاید حسّاس صاحب کو معلوم نہیں کہ تحریک خلافت کے زمانے میں صورت حال یہ تھی کہ ایک طرف حضرت شیخ الہند اور ان کے چند رفقاء انگریز کے جبر و تشدد اور مظالم کا شکار تھے اور دوسری طرف تمام عوام حضرت تھانوی کا دشمن جان بنا ہوا تھا۔ تو عافیت تو نہ ادھر تھی نہ ادھر۔ یہ بالکل ممکن تھا کہ اس زمانہ میں حضرت تھانوی بھی وہی طرز عمل اختیار کر لیتے جو اس زمانہ میں عام طور سے علماء کا تھا کہ وہ نہ انگریز کے جبر و تشدد کا نشانہ بنے اور نہ عوام کے معتوب ہوئے۔
اور یقیناً یہ رخصت کا مقام تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انگریز نے تمام علماء پر ہاتھ نہیں ڈالا اس کا ہدف وہی تھا جو مقام عزیمت پر قائم تھے۔ ایک طرف حضرت شیخ الہند اور ان کے چند رفقاء جیسا کہ کربلا میں حضرت حسین اور اہل بیت رسول اور چند رفقاء سے

جز قیس اور کوئی نہ آیا بروئے کار ‏ ‏ ‏ صحرا مگر بہ تنگیٔ چشم حسود تھا

اور دوسری طرف حضرت تھانوی جو عوام کی مخالفت کا ہدف بنے ہوئے تھے۔ چنانچہ اطراف و اکناف ملک سے گمنام تہدید آمیز خطوط موصول ہو رہے تھے اور قتل کی دھمکیاں دی جا رہی تھیں۔
چنانچہ عوام سے جو اندیشے اس وقت لاحق تھے اس کے پیش نظر حضرت مولانا خلیل احمد صاحب محدث سہارنپوری نے ازراہ غایت شفقت و عنایت حضرت تھانوی کو مشورہ دیا کہ اختلاف رائے اپنی جگہ ہے لیکن خوف و خطر میں شرعاً گنجائش ہے کہ اختلاف رائے سے مجتنب رہیں۔
حضرت تھانوی نے جواب میں عرض کیا کہ اگر خوف خلائق ہی کو خاطر میں لایا جائے تو حکومت سے زیادہ نقصان پہنچ سکتا ہے بمقابلہ عوام کے۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ کس درجہ عوام سے خطرات لاحق

تھے کہ حضرت مولانا خلیل احمد صاحبؒ جیسی شخصیت کو مشورہ دینا پڑا۔ اگر عافیت کوشی مطلوب و مقصود ہوتی تو اس سے بہتر موقع مشورہ کو قبول کرنے کا اور کون سا ہو سکتا تھا۔

بہرحال یہ بات بالکل واضح ہے کہ خلافت کمیٹی کے زمانہ میں حضرت تھانوی کا "الگ تھلگ" رہنا نہ تو سیاسی بے بصیرتی کی بنا پر تھا نہ عافیت کوشی مطمح نظر تھا۔

حسّاس صاحب نے ایک اور بات مزے کی فرمائی۔ فرماتے ہیں کہ حضرت کے خدام میں ایک بزرگ مولانا خیر محمد ایسے تھے جنہوں نے ہمیشہ جوڑنے کی فکر کی۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ تھانوی جماعت میں مولانا خیر محمد صاحبؒ کے علاوہ جتنے ہیں سب کے سب بجائے جوڑنے کے توڑنے میں لگے رہے۔ انا للہ۔

ذیل میں ہم چند واقعات ذکر کرتے ہیں:

(۱) ۱۹۳۵ء کے لگ بھگ ایک بار حضرت مولانا حسین احمدؒ تھانہ بھون تشریف لائے۔ عصر کے وقت جب حضرت تھانوی نماز عصر کے لئے اٹھے تو دیکھا حضرت مولانا حسین احمدؒ وضو کر رہے ہیں بس وہیں رک گئے اور انتظار کرتے رہے۔ جب حضرت مولانا وضو کر چکے تب حضرت مصلّے کی طرف بڑھے۔

یہ واقعہ کم از کم میرے لئے اس لئے اہم ہے کہ میں نے اپنے دس پندرہ سالہ زمانۂ قیام تھانہ بھون میں اس طرح کسی کا انتظار کرتے حضرت کو کبھی نہیں دیکھا۔

اس سلسلہ میں دوسری بات قابلِ غور یہ ہے کہ حضرت مولانا حسین احمد صاحب کو ایسی کیا پڑی تھی کہ اپنی بے پناہ تدریسی مشغولیتوں اور بلاخیز سیاسی مصروفیتوں کے باوجود تھانہ بھون جیسے دور افتادہ قصبہ کے اندر زحمت سفر اٹھا کر پہنچے اور پھر حضرت کا ان کے ساتھ یہ خصوصی احترام بھی

کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

(۲) دوسرا واقعہ سنئے۔ حضرت عبدالماجد دریاآبادیؒ ہمیشہ حضرت تھانوی سے بیعت ہونے کی درخواست کرتے رہے اور حضرت کا جواب ہمیشہ یہی ہوتا کہ آپ کو مولانا حسین احمد صاحب سے مناسبت ہے۔ آپ وہاں بیعت ہوں۔

حد ہوگئی کہ مولانا عبدالماجد دریاآبادی نے خود حضرت مولانا حسین احمد صاحبؒ سے سفارش کرائی اور حضرت مولانا حسین احمد صاحب نے فرمایا کہ میں ان کی تربیت کی اہلیت نہیں رکھتا۔ حضرت تھانویؒ نے فرمایا کہ یہ تو محض تواضع ہے حقیقت یہ ہے کہ ان کی تربیت و تکمیل کے لئے میں بھی اور آپ بھی دونوں ہی کافی ہیں مگر بات یہ ہے کہ ان کو آپ سے مناسبت ہے اس لئے آپ سے ہی بیعت ہونا ان کے حق میں مفید ہے۔

(۳) حضرت کے ملفوظات میں ہے کہ مولانا حسین احمد نہایت شریف طبیعت کے انسان ہیں۔ باوجود سیاسی اختلاف کے کبھی ان کی طرف سے کوئی دلآزاری کا کلمہ سننے میں نہیں آیا۔

(۴) لاؤڈ اسپیکر کے مسئلہ میں حضرت تھانوی نے حضرت مولانا حسین احمدؒ کا نام لے کر ان کے فتویٰ سے اتفاق کیا۔ ملاحظہ ہو امداد الفتاویٰ۔

(۵) ڈاڑھی کے مسئلہ پر حضرت مولانا حسین احمد صاحب کا جو مضمون فلسفۂ ڈاڑھی کے نام سے ہے اس کو خاص طور سے حضرت تھانوی نے امداد الفتاویٰ میں نقل کرایا۔

(۶) ایک مرتبہ سہارن پور میں مولانا عطاء اللہ شاہ بخاریؒ تقریر کر رہے تھے۔ دوران تقریر تحدیث بالنعمۃ کے طور پر ذکر کر رہے تھے کہ میرے ساتھ بزرگوں نے ہمیشہ شفقت کا معاملہ کیا۔ اسی میں ایک جملہ یہ بھی کہا کہ

"تھانہ بھون گیا تو تھانوی نے سینہ سے لگا لیا"

حساس صاحب بتائیں کہ یہ سب باتیں جوڑنے کی ہیں یا توڑنے کی۔

حضرت نے جب مفقود الخبر کے مسئلہ میں مالکی مذہب کو اختیار کیا تو جب تک اس پر تمام علماء کے دستخط نہیں کرائے اس وقت تک اس کو شائع نہیں کیا۔

یہ چند مثالیں مشتے از نمونہ خروارے کے طور پر عرض کی گئیں۔

حرفِ آخر

اب آخری بات اس سلسلہ میں غور کرنے کی یہ ہے کہ فساد باطن کے ساتھ علوم ظاہری میں تو آدمی کمال حاصل کر سکتا ہے۔ لیکن روحانی ارتقاء ممکن نہیں ہے۔

مولانا تھانوی کی صورت حال یہ ہے کہ علوم ظاہرہ کے ساتھ ساتھ روحانی علوم میں بھی حضرت تھانوی علمائے دیوبند کی روحانی توجہات کا مرکز رہے ہیں۔

پھر اگر حضرت تھانوی کی اخلاقی کیفیات وہی ہیں جس کی نقشہ کشی حساس صاحب کر رہے ہیں تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کے ہوتے ہوئے روحانیات میں حضرت تھانوی کو وہ مقام کیوں کر ممکن ہوا کہ حضرت مولانا خلیل احمد صاحب نے بھی بعض دقیق روحانی مسائل میں حضرت تھانوی سے مشورہ کیا۔

حضرت مولانا خلیل احمد صاحب کون شخص ہیں؟

جو ان کو جانتا ہے وہ تو جانتا ہی ہے لیکن آج کا نوجوان جو ان کو نہیں جانتا ہوگا اس کے تعارف کے لئے عرض ہے کہ حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی تھانوی رقم طراز ہیں کہ:-

حضرت مولانا خلیل احمد صاحبؒ پانچویں حج میں جب طواف قدوم کے لئے حرم شریف میں داخل ہوئے تو مولانا محب اللہ خلیفہ حضرت حاجی صاحب قدس سرہ نے فرمایا کہ دیکھو کون آیا کہ پورا حرم منوّر ہو گیا ؎

یہ کون آیا کہ دھیمی پڑ گئی لَو شمع محفل کی
پتنگوں کے عوض اڑنے لگیں چنگاریاں دل کی

پھر طواف قدوم کے بعد جب حضرتؒ نے مولانا محب اللہ صاحب سے ملاقات کی تو انہوں نے فرمایا کہ اچھا آپ ہی تھے جس کی وجہ سے پورا حرم منوّر تھا۔"

یہاں یہ شبہ نہ کیا جائے کہ حرم تو پہلے ہی منوّر ہے ان کے آنے سے منور ہونے کے کیا معنی! تو بات یہ ہے کہ حرم انوارِ الوہیت سے معمور ہے اور یہ انوارِ عبدیت تھے اور دونوں کا رنگ الگ الگ ہے اور اربابِ معرفت کو یہ امتیاز خوب ہوتا ہے۔

حضرت مولانا خلیل احمد صاحبؒ فرماتے ہیں کہ ان کی تحریر و تقریر میں کہیں انگلی رکھنے کی جگہ نہیں ہوتی ؎

لکھتا ہوں اسد سوزشِ دل سے سخنِ گرم
تا رکھ نہ سکے حرف پہ میرے کوئی انگشت

حضرت مولانا شبیر احمد صاحبؒ جب تعزیت کے لئے تھانہ بھون تشریف لائے تو آنکھیں اشکبار تھیں اور یہ فرمایا کہ اگر کوئی شبہ پیش آتا تھا تو یہ تسلی رہتی تھی کہ تھانہ بھون جائیں گے تو حضرت سے یہ شبہ حل ہو جائے گا۔ چنانچہ حضرت مولانا شبیر احمد صاحبؒ نے جو حضرت تھانوی کا جو مرثیہ لکھا اس کا ایک شعر یہ ہے ؎

جائیں کہاں ازالۂ شبہات کے لئے
اب ایسا اپنا کوئی ٹھکانہ نہیں رہا

یہ چند سطور اس لئے لکھی گئیں تاکہ ریکارڈ درست رہے لیکن اس کے باوجود اگر کسی کو اپنے مخصوص خیالات پر اصرار ہے تو ظاہر ہے کسی کے خیالات کو جبراً نہیں بدلا جا سکتا:

فان یکفر بھا ھٰؤلاءِ فقد وکلنا بھا قوما لیسوا بھا بکٰفرین
(سورۂ انعام آیت ۸۹)

ڈاکٹر اسرار احمد

نے اپنی دوسری دینی اور علمی خدمات کیساتھ ساتھ شادی بیاہ کی تقریبات کے ضمن میں

ایک اصلاحی تحریک

بھی برپا کی اور ــــ خطبۂ نکاح ــــ کو صرف ایک رسم

کی بجائے واقعی تذکیر و نصیحت اور معاشرتی زندگی سے متعلق اسلامی تعلیمات کو عام کرنے کا ذریعہ بنایا

اس موضوع پر ڈاکٹر صاحب کی ایک اہم تحریر اور ایک خطبۂ نکاح کو دیدہ زیب کتاب کی صورت میں شائع کر دیا گیا ہے۔

بڑے سائز کے ۴۸ صفحات ○ عمدہ دبیز کاغذ ○ دیدہ زیب کور،

ہدیہ: ۴ روپے ــــــــ محصول ڈاک علاوہ

Coca-Cola
Coca-Cola is it!
TRADE-MARK REGD.
THE COCA-COLA COMPANY

رفتارِ کار

کراچی میں امیرِ تنظیم کی مصروفیات اور سہ روزہ قرآنی تربیت گاہ

اللہ کے فضل و کرم سے ۱۰ نومبر ۸۵ء کو تنظیم اسلامی کا چوتھائی علاقائی اجتماع حیدر آباد میں اختتام پذیر ہوا۔ اس اجتماع کو حیدر آباد کے رفقاء نے انتھک جدوجہد سے کامیاب بنایا اور میزبانی بھی خوب کی لیکن وہ انتظامی مصروفیات کی وجہ سے خود زیادہ استفادہ نہیں کر سکے تھے۔ اس لئے فیصلہ کیا گیا کہ کراچی میں ایک سہ روزہ قرآنی تربیت گاہ کا اہتمام کیا جائے جس میں خصوصی طور پر حیدر آباد کے رفقاء اور ایسے رفقاء جو کسی مجبوری کے تحت علاقائی اجتماعات میں شریک نہ ہو سکے ہوں اس تربیت گاہ میں شرکت کر سکیں۔ اللہ کا خصوصی فضل و کرم ہوا کہ کراچی کو ایسے باصلاحیت تجربہ کار ناظم تربیت گاہ بھی مل گئے جن کے خلوص و عزم و اللہ کی تائید سے یہ تربیت گاہ بحمد اللہ کامیاب رہی۔ راقم کی مراد جناب مختار حسین صاحب فاروقی سے ہے جو تنظیم اسلامی کراچی شرقی کے حیدر آباد کے اجتماع کے موقع پر ہی امیر مقرر کئے گئے۔ ان کی اور ان کے رفقاء کی دن رات کی محنت نے اس پروگرام کو کامیابی سے ہم کنار کیا۔

تربیتی پروگرام کا آغاز ۲۴ دسمبر کی شام سے ہوا۔ امیر محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے بعد نماز عشاء تربیت گاہ یعنی کے ایم سی اسپورٹس کمپلیکس کورنگی نمبر ۲½ کے وسیع و عریض ہال میں خطاب فرمایا۔ موضوع تھا "پاکستان میں اسلامی انقلاب کیا؟ کیوں؟ اور کیسے؟"۔ ہال میں فرشی انتظام کیا گیا تھا۔ اور باہر برآمدوں میں اور میدان میں کرسیوں کا انتظام تھا۔ ہال کے باہر کلوز سرکٹ پر چار عدد ٹی وی رکھے گئے تھے تاکہ باہر بیٹھنے والے اصحاب مقرر کو دیکھ سکیں۔ کلوز سرکٹ کے انتظام میں کچھ تاخیر ہوئی جس کی وجہ سے کافی حضرات جگہ نہ ملنے کی وجہ سے واپس ہو گئے۔ بہرحال جب انتظام ٹھیک ہو گیا تو باہر بھی لوگ اطمینان سے امیر محترم کا خطاب سنتے اور دیکھتے رہے۔

۲۵ دسمبر کو بعد نماز فجر راقم نے درس حدیث دیا۔ ناشتہ کے وقفہ کے بعد شمالی تنظیم کراچی کے امیر محترم سراج الحق سید صاحب نے خطاب فرمایا۔ آپ نے تربیت گاہ میں نظم و ضبط اور اس سے بھرپور فائدہ اٹھانے کی شرکاء کو نصیحتیں کیں۔ دوسری گفتگو وسطی تنظیم کراچی کے امیر واحد علی رضوی صاحب نے کی۔

آپ نے دینی فرائض کا جامع تصور کے بنیادی نکات کی یاد دہانی کروائی۔ اس کے بعد امیر محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے حاضرین کے سوالات کے جوابات دیئے جو دو گھنٹہ تک جاری رہے۔ اس کے بعد وقفہ ہوا۔ اور چوہدری غلام محمد صاحب قیم تنظیم اسلامی پاکستان نے منتخب نصاب نمبر ۲ کا درس نمبر ۲ دیا۔

عصر کے بعد رفقاء کا باہمی تعارف ہوا۔ اس کے بعد حافظ عرفان احمد صاحب نے خطاب فرمایا۔ حافظ صاحب عرصہ تیس سال سے ابوظہبی میں رہتے ہیں اور آپ وہاں ۲۰ سال سے درس قرآن حکیم دے رہے ہیں۔ آپ کو عربی و انگریزی پر عبور حاصل ہے۔ امیر محترم کے حالیہ دورہ ابوظہبی میں آپ نے امیر محترم کے ہاتھ پر بیعت کی ہے۔ بعد نماز مغرب محترم اسد الرحمٰن صاحب فاروقی نے امیر محترم کی تحریر "دعوت رجوع الی القرآن" کا مطالعہ شروع کروایا۔ بعد نماز عشاء جناب مختار حسین صاحب فاروقی امیر شرقی تنظیم کراچی نے امیر محترم کی کتاب "سرافگندیم" میں سے ایک باب بعنوان "امت مسلمہ کا عروج و زوال" کا مطالعہ شروع کروایا۔ یہ سلسلہ ۱۰ بجے رات تک جاری رہا۔ ۲۶ کو بعد نماز فجر ہمارے بزرگ رفیق محترم عبدالخالق صاحب نے اذکار مسنونہ سے متعلق خطاب فرمایا۔ ناشتہ کے بعد محترم اسد الرحمٰن فاروقی صاحب نے "دعوت رجوع الی القرآن" کا مطالعہ جاری رکھا جس میں برصغیر پاک و ہند میں اسلام کا ورود اول سندھ میں اور ورود ثانی شمال مغرب سے اور ہندوستان میں مسلمانوں کا عروج اور ساتھ ہی اسلام کے زوال کی انتہا ۔ الف ثانی (یعنی دوسرے ہزار سال) کے تجدیدی کارناموں جیسے موضوعات زیر بحث آئے۔

۹ بج کر ۲۰ منٹ پر چوہدری غلام محمد صاحب نے منتخب نصاب نمبر ۲ کا تیسرا درس دیا۔ درمیان میں چائے کے لئے وقفہ ہوا۔ اس کے بعد چوہدری صاحب نے درس نمبر ۴ اور ۵ کو ایک ہی نشست میں مکمل کیا۔ ۱۲ بجکر ۱۵ منٹ پر اسد الرحمٰن فاروقی صاحب نے چھٹا درس شروع کیا اور تقریباً ۴۵ منٹ میں نہایت جامعیت کے ساتھ اقامت دین کی جدوجہد کرنے والی جماعت کی ہیئت ترکیبی اور تنظیمی اساس کو قرآن حکیم کی آیات بینات کی روشنی میں بیان کیا۔

نماز عصر کے بعد مختار حسین فاروقی صاحب نے حسب معمول "سرافگندیم" کتاب کا مطالعہ کروایا۔ یہ سلسلہ نماز مغرب کے بعد بھی جاری رہا۔ اس طرح "امت مسلمہ کے عروج و زوال" کا مضمون مکمل ہوا۔

تقریباً ساڑھے سات بجے سے ۹ بجے تک سیرت صحابہؓ کے ذیل میں حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کی مثالی سیرت کا مطالعہ ہوا۔ ۹ بجے بھائی عبدالخالق صاحب نے اذکار مسنونہ پر گفتگو کی۔

رات ۹ بج کر ۱۵ منٹ پر مختار حسین فاروقی صاحب نے "سرافگندیم" کتاب کے دوسرے باب کا مطالعہ کروایا۔ اس باب میں امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی وہ تاریخی تحریر ہے جو آپ نے جولائی ۱۹۷۴ء میں ۲۱ روزہ قرآنی تربیت گاہ کے اختتام پر کی تھی جس میں تنظیم اسلامی کے قیام کا اعلان کیا گیا تھا۔ ۱۰ بجے شب یہ نشست اختتام کو پہنچی۔

۲۷ دسمبر کو نماز فجر کے بعد راقم کا بیان تھا۔ ناشتے وغیرہ سے فراغت کے بعد ۸½ بجے فضل خالق صاحب کی تلاوتِ کلام پاک سے آخری نشست کا آغاز ہوا۔ موصوف کو اللہ تعالیٰ نے خوش الحانی کی نعمت سے نوازا ہے۔ آپ نے سورۂ آل عمران کی آیات ۱۰۲ تا ۱۱۰ کی تلاوت کی اس دوران مسنون "محفل سماع" کا سماں تھا۔ فجزاہ اللہ لذلک

۸ بج کر ۵۴ منٹ پر چوہدری غلام محمد صاحب نے منتخب نصاب نمبر ۲ کے درس نمبر ۷، ۸، اور ۹ کا خلاصہ بیان کیا۔ یوں متذکرہ منتخب نصاب کی تکمیل ہوگئی۔ اس کے بعد اسد الرحمٰن فاروقی صاحب نے تحریک رجوع الی القرآن کے مطالعہ کے ضمن میں ایک چارٹ کی مدد سے تفصیلی جائزہ پیش کیا۔ بعدازاں ناظم تربیت گاہ جناب محمد حسین فاروقی صاحب نے تربیت گاہ کے اختتام کا اعلان کیا۔

متذکرہ بالا تربیت گاہ سے متصلاً قبل امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے ۲۲ دسمبر کو پاکستان مشین ٹول فیکٹری کالونی میں بعد نماز عشاء جلسہ عام سے خطاب فرمایا۔ آپ سے قبل اسد الرحمٰن فاروقی صاحب نے بھی خطاب کیا۔ ۲۳ دسمبر کو حسب معمول تاج محل ہوٹل میں شام الہدیٰ کی نشست منعقد ہوئی۔ اس دفعہ امیر محترم نے سورہ شوریٰ آیات ۱۳، ۱۴ اور ۱۵ کی روشنی میں فریضہ اقامت دین اور اس کے لئے جدوجہد کرنے والی جماعت کے کارکنوں کے اوصاف بیان کئے۔ قارئین آگاہ ہوں گے کہ یہ نشست پاکستان ٹیلی ویژن کے انتہائی مقبول پروگرام "الھدیٰ" کا تسلسل ہے۔ "الھدیٰ" تقریباً تین سال قبل ایک سازش کے تحت چند مغرب زدہ خواتین کے احتجاج کی آڑ میں بند کر دیا گیا تھا لیکن ہدایت ربانی کا سلسلہ بند نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ کراچی اور لاہور میں "شام الہدیٰ" کا اہتمام کیا گیا ہے۔ جہاں پر الحمد للہ قرآن حکیم کا منتخب نصاب ترتیب سے بیان ہو رہا ہے۔ "شام الہدیٰ" کے سارے پروگراموں کے وڈیو کیسٹ بنا لئے گئے ہیں۔ جو دفتر تنظیم اسلامی کراچی سے حاصل کئے جا سکتے ہیں۔

۲۴ دسمبر کو امیر محترم نے PECSIR کے افسران اور عملے کے دیگر افراد سے خطاب فرمایا۔ اللہ کا احسان ہے کہ تین ایام میں امیر محترم نے قرآن حکیم کی انقلابی دعوت کو دلنشین اور مؤثر پیرائے میں بیان فرمایا۔ قارئین سے درخواست ہے کہ امیر محترم کی صحت کے لئے دعا فرمائیں۔

مرتب: ضمیر اختر خان، رفیق تنظیم اسلامی، کراچی

اعتذار: "استحکام پاکستان" کی اہمیت و افادیت کے پیش نظر بعض مضامین کی اشاعت روکنی پڑی جن میں "دورۂ ابوظہبی" کی روداد" بھی شامل ہے۔

نزلہ، کھانسی اور زکام
سردی کے موسم میں عام
مناسب احتیاط برتیے ۔ بروقت سُعالین لیجیے
سردیوں میں اگر آپ کو نزلہ، زکام، کھانسی
یا گلے میں خراش کی شکایت ہو جائے
تو فوراً سُعالین کا باقاعدہ استعمال شروع
کر دیجیے۔ اور اگر خدانخواستہ تکلیف بڑھ
جائے تو ایک پیالی تیز گرم پانی میں سُعالین کی
چار ٹکیاں حل کر کے جوشاندے کے طور پر
صبح و شام پیجیے۔
سُعالین آپ کو ان بیماریوں سے محفوظ بھی
رکھتی ہے اور نجات بھی دلاتی ہے۔
SUALIN
سُعالین
شیشی میں بھی دستیاب ہے
اور نئے اسٹرپ پیکنگ میں بھی۔
نوزو
ناک کے ورم، سوزش اور بندش کے لیے مفید۔
ایک پھوار ناک کھول دیتی ہے۔
ہمدرد
ہم خدمتِ خلق کرتے ہیں
اخلاق عملاً مذہب ہے اور مذہب اصولاً اخلاق ہے۔
ADARTS-SUA-3/85

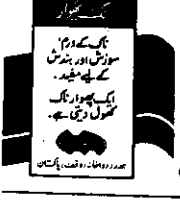

ہر دانہ منتخب

فریش ویل
بادام اور پستہ

تلے ہوئے - تازہ
مصالحے دار - ذائقے دار

نمکینیت کے نئے پہلو اور
بھرپور ذائقے کے ساتھ

ناشتے پر
چائے پر یا کسی بھی وقت
لذت میں ایک خوشگوار اضافہ

جدید ترین نائٹروجن پلانٹ پر
پیک کیے جاتے ہیں۔
سیل بند ڈبے کو کھولنے کا سہل ترین
طریقہ پاکستان میں پہلی بار
ہم نے متعارف کرایا۔

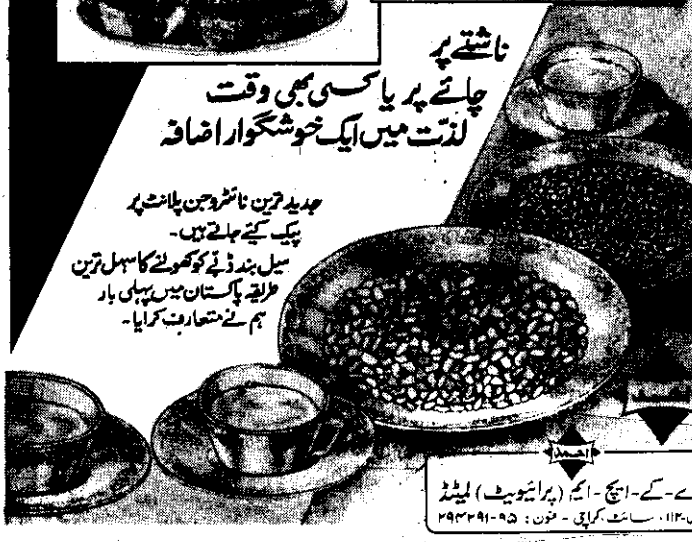

اے۔کے۔ایچ۔ایم (پرائیویٹ) لمیٹڈ
ڈی-۱۱۲، سائٹ کراچی - فون: ۲۹۳۲۹۱-۹۵

ٹینٹ اور ترپال

بنانے کا
ممتاز ادارہ

ایچ نظام دین
اینڈ سنز

مرکزی دفتر

محمد بن قاسم روڈ۔ کراچی

الہدیٰ
کیسٹ سیریز

ڈاکٹر اسرار احمد (امیر تنظیم اسلامی)
کے مطالعہ قرآن حکیم کے منتخب نصاب پر مشتمل

درسِ قرآن

کے ۳۰ کیسٹس سی T-D-K 60 جاپانی
کیسٹ پر ریکارڈ کروائے گئے ہیں جس کی قیمت
-/۹۰۰۱ روپے ہے۔ لاہور سے باہر رہائش
پذیر خواہش مند حضرات -/۹۱۰۱ روپے بذریعہ بنک
ڈرافٹ / منی آرڈر نشر القرآن کے نام درج ذیل
پتہ پر بھجوا کر یہ کیسٹس حاصل کر سکتے ہیں۔

نشر القرآن
کیسٹ سیریز

۳۶۔ کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور ۱۴
فون: ۸۵۲۶۱۱

سب آفس: ۱۱ داؤد منزل نزد آرام باغ، شاہراہ لیاقت کراچی
کراچی فون برائے رابطہ: ۲۱۴۷۰۹

عام طور پر ہمارے یہاں

توحید علمی و نظری ــ یعنی ــ توحید فی العقیدہ

پر تو بہت زور دیا جاتا ہے، لیکن

توحیدِ عملی

پر کما حقہٗ توجہ نہیں دیجاتی

ڈاکٹر اسرار احمد

پر اللہ تعالیٰ نے سورۂ زمر تا سورۂ شوریٰ پر تدبر کے دوران

توحیدِ عملی کے انفرادی اور اجتماعی تقاضوں

یعنی: اخلاص فی العبادت اور اقامتِ دین کی فرضیت

کو خوب منکشف بھی فرمایا اور بیان کی توفیق بھی مرحمت فرمائی، اور

شیخ جمیل الرحمٰن کی محنت نے ان خطابات کو کتابی صورت دیدی

سائز ۱۸ × ۲۲/۸ ○ صفحات ۱۹۲ ○ عمدہ سفید کاغذ ○ دیدہ زیب کور

ہدیہ: ۱۵ روپے، علاوہ محصول ڈاک

مکتبہ تنظیم اسلامی: ۳۶ کے ماڈل ٹاؤن ○ لاہور ۱۴

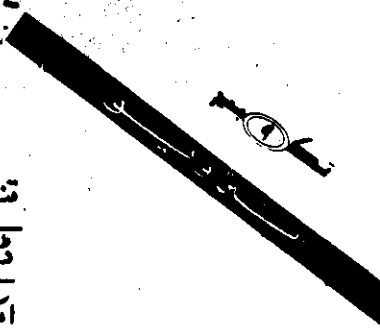

تنظیم اسلامی کے امیر

ڈاکٹر اسرار احمد سے

ایک فکر انگیز انٹرویو

گفتگو : محمد صلاح الدین ۔ ثروت جمال اصمعی

اسلام انتخابی سیاست کے ذریعے نہیں آسکتا

اس کے لیے انقلابی طریقِ کار ناگزیر ہے

قرآنی تعلیمات پر مبنی اپنے فکری پروگرام الہدیٰ کے حوالے سے ڈاکٹر اسرار احمد پاکستان کے علمی اور عوامی دونوں حلقوں میں کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ اللہ کی زمین پر اللہ کے دین کا قیام زمانۂ طالب علمی سے ہی ان کی زندگی کا نصب العین رہا ہے اور اس کی خاطر وہ اپنے انداز میں مسلسل سرگرم عمل ہیں۔ اسلامی جمعیت طلبہ کے ابتدائی برسوں میں اس کے ناظم اعلیٰ رہ چکے ہیں۔ پھر جماعت اسلامی میں شامل ہوئے اور مرکزی شوریٰ کے رکن رہے۔ لیکن بعض اختلافات کی بناء پر ۱۹۵۶ء میں جماعت سے علیحدگی اختیار کر لی۔ کچھ عرصے بعد تنظیم اسلامی کے نام سے اپنی ایک الگ جماعت بنائی۔ جس کا مقصد انتخابی عمل کے بجائے انقلابی طریقۂ کار اختیار کر کے اسلامی نظام قائم کرنا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے ذہن میں اسلامی انقلاب کا کیا نقشہ ہے اور وہ اس کے لئے کس طرح کام کر رہے ہیں لوگ عموماً اس سے بہت کم واقف ہیں۔ اپنے قارئین کو اس بارے میں آگاہ کرنے کے لئے "تکبیر" نے چند روز پہلے کراچی میں ڈاکٹر صاحب سے ایک انٹرویو کا اہتمام کیا جس کی تفصیلات آپ کے سامنے ہیں۔

س :۔ آپ اسلامی انقلاب کے داعی ہیں اور اس کے لیے آپ نے ایک الگ تنظیم کی بنیاد رکھی ہے۔ براہ کرم تفصیل سے بتائیے کہ اس انقلاب کو برپا کرنے کا کیا نقشہ آپ کے ذہن میں ہے؟

ج :۔ مجھے یہ طے کرنے میں دقت ہو رہی ہے کہ میں بات شروع کہاں سے کروں۔ اصل میں جب میں اسلامی انقلاب کا لفظ استعمال کرتا ہوں تو سب سے پہلے مجھے یہ واضح کر دینا چاہیئے کہ اس سے میری مراد کیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے ہاں عام طور پر یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ کچھ تعزیرات اور کچھ قوانین کی تنفیذ ہو جائے تو شاید اسلام کو قائم کرنے کا تقاضا اس سے پورا ہو جاتا ہے جبکہ میرے نزدیک اقامت دین یا غلبۂ دین سے اصلاً جو شے مراد ہے وہ یہ ہے کہ پورا کورس آف لائف اور پورا سوشیو اکنامک سسٹم تبدیل ہو۔ زندگی کا پورا نظام ایک کل کی حیثیت سے اگر نہیں بدلتا تو محض جزوی اصلاح اسلام کو بدنام کرنے کا ذریعہ تو بن سکتی ہے لیکن اسلام کی کوئی مفید خدمت اس طرح انجام نہیں دی جا سکتی۔ اب ظاہر بات ہے کہ جب بھی پورے نظام کو بدلنے کے لئے کوئی جدوجہد کی جاتی ہے کسی بھی معاشرے میں جو پاور اسٹرکچر رائج ہوتا ہے، وہ ہمیشہ کوشش کرتا ہے کہ جو نظام قائم ہے اسی کو برقرار رکھے، یعنی اسٹیٹس کو مین ٹین رکھا جائے۔ اس کی مختلف شکلیں ہوتی ہیں۔ اگر سماجی سطح پر کچھ لوگوں کو نسلی اعتبار سے برتری حاصل ہے، سید ہیں، پیرزادے ہیں، جو سمجھتے ہیں کہ ان کو دوسروں کے مقابلے میں ایک بلند تر مقام حاصل ہے تو وہ ہرگز نہیں چاہیں گے کہ مروجہ نظام جس سے ان کے مفادات وابستہ ہیں، تبدیل ہو۔ اسی طرح اگر سرمایہ دار کو کچھ خصوصی مراعات حاصل ہیں اور وہ معاشرے کے اوپر چھایا ہوا ہے تو وہ کبھی اس نظام کو بدلنا نہیں چاہے گا۔ جاگیردار، زمیندار بدلنا نہیں چاہے گا۔

اب جہاں تک معاملہ ہے سیاسی اور انتخابی عمل کا تو درحقیقت یہ جس شے کا نام ہے میرے نزدیک اس کے کچھ مفید پہلو بھی ہیں اور اس کی کچھ تحدیدات LIMITATIONS بھی ہیں۔ افادیت کا پہلو تو یہ ہے کہ کسی ملک میں جو نظام قائم ہے، اگر سیاسی عمل جاری رہے، الیکشن ہوتے رہیں تو بے چینی نہیں ہوگی اور مختلف طبقات میں یا مختلف علاقوں کے لوگوں میں کوئی احساس محرومی پیدا نہیں ہوگا اور یہ کہ کچھ نہ کچھ بہتر یا تھا اس نظام کو چلانے کے

طور پر کبھی بھی تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جو پاور اسٹرکچر ہے، ووٹ کے ذریعے اسی کی نمائندگی ہوگی اور جو لوگ اس پاور اسٹرکچر میں ووٹ لے کر بیٹھیں گے وہ کبھی اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارنے کو تیار نہیں ہوں گے۔ لہٰذا تشخیص ہمیں یہ کرنی ہوگی کہ کیا یہ نظام بنیادی طور پر غلط ہے یا اس میں صرف ثانوی اعتبار سے خرابیاں ہیں۔

میری تشخیص یہ ہے کہ یہ نظام اسلام کی رو سے بنیادی طور پر غلط ہے اس لیے میں اس کی تبدیلی کے لئے محض سیاسی عمل کو مفید نہیں سمجھتا۔ میں قائل ہوں کہ سیاسی عمل ملک میں جاری رہنا چاہیئے تاکہ بے چینیاں، بے اطمینانیاں، علاقائیت پرستی، علیحدگی پسندانہ رجحانات وغیرہ ختم ہوں لیکن نفاذ اسلام کے لئے انقلابی عمل ناگزیر ہے۔

اب مجھے بتانا ہوگا کہ انقلابی عمل کیا ہے۔ میرے نزدیک اس کے چھ مراحل ہیں جن میں سے گنتی کے اعتبار سے تو تین پہلے ہیں اور تین بعد میں۔ لیکن حقیقت میں وہ شروع ساتھ ہی ساتھ ہو جاتے ہیں۔ وہ ایک دوسرے کو اوورلیپ کرتے ہیں یعنی پہلے مرحلے کے ساتھ ہی چوتھا بھی شروع ہو جاتا ہے، لیکن بیان کرنے میں وہ علیحدہ علیحدہ آئیں گے۔

کسی بھی انقلابی عمل کے لئے پہلے ایک انقلابی نظریہ ضروری ہے۔ اس نظریہ کی نشر و اشاعت بھرپور طریقے پر جو بھی وسائل میسر ہوں ابلاغ کے، ان سب کو بروئے کار لا کر۔ یہ اس کام کا پہلا مرحلہ ہے۔

پھر جو لوگ اس نظریے کو قبول کر لیں، فیس ویلیو پہ، شعوری طور پر ان کو منظم کیا جائے یعنی دوسرا مرحلہ تنظیم ہے۔

تیسرا مرحلہ ان لوگوں کی تربیت کا ہے۔ اور اس تربیت کی مناسبت ہونی چاہیئے اس نظام سے جو آپ لانا چاہتے ہیں۔

یہ تین ابتدائی مراحل ہیں، اور ان کے نتیجے میں ایک انقلابی پارٹی وجود میں آ جاتی ہے۔ اس انقلابی پارٹی کے لئے میرے نزدیک ضروری ہے کہ جب تک وہ اپنی تعداد اور تنظیم و تربیت کے لحاظ سے اتنی مضبوط نہ ہو جائے کہ خود اپنے اندازے کے مطابق اپنے آپ کو کسی ڈائریکٹ ایکشن کے قابل محسوس کرنے لگے، اس وقت تک اس کے لئے لازم ہے کہ صرف یہی تین کام کرتی رہے چوتھا کوئی کام نہ کرے۔

میں اپنے آپ کو اُسی اسلامی تحریک کا جزو سمجھتا ہوں جو مولانا مودودیؒ نے برپا کی۔

ورک یا ایسی ہی کسی اور کام میں وہ لگ جائے تو یہ اس کی قوت کا ضیاع ہوگا۔ لہٰذا اس کو ان ہی تین کاموں پر اپنی ساری توجہ مرکوز رکھنی چاہیئے حتیٰ کہ وہ اپنے آپ کو اس قابل سمجھے کہ اب ہمارے پاس اتنی طاقت ہے کہ ہم مروجہ نظام کے خلاف کوئی راست اقدام کر سکتے ہیں۔

ان تین کاموں کے دوران جو چوتھا کام خود بخود ہوگا وہ یہ ہے کہ جیسے ہی آپ اپنا انقلابی نظریہ لوگوں کے سامنے پیش کرنا شروع کریں گے، تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ جو نظام رائج ہے آپ اس کی نفی کر رہے ہیں اور یہ کہہ رہے ہیں کہ وہ ظالمانہ ہے یا باطل ہے یا غلط ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ آپ نے اس نظام کے خلاف جارحیت کی ہے۔ نتیجتاً اس کی طرف سے ردِّ عمل ہوگا۔ یہ ردِّ عمل شروع میں زبانی کلامی ہوتا ہے۔ انقلاب کے علمبرداروں کو دیوانے، مجنوں وغیرہ کے خطابات سے نوازا جاتا ہے۔ پھر ذرا آگے بڑھ کر مروجہ نظام کے کرتا دھرتا یہ محسوس کرتے ہیں کہ یہ آواز محض مجذوب کی بڑ نہیں ہے بلکہ معاملہ سنجیدہ ہے اور سنجیدگی سے اس کا نوٹس لیا جانا چاہیئے۔ یہ محض مشتِ غبار نہیں بلکہ آندھی بن سکتا ہے۔ اس مرحلے پر تشدد شروع ہوتا ہے۔ مار دھاڑ، اذیت رسانی، گھروں سے نکالا جانا خصوصاً نوجوانوں کو، کیونکہ وہی کسی بھی انقلابی تحریک کا ہراول دستہ ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ سوسائٹی کا جو طبقہ کسی اعتبار سے دبا ہوا ہے وہ خاص طور پر اس چکی میں پستا ہے۔ اس پورے مرحلے میں PASSIVE RESISTANCE کی ضرورت ہوتی ہے۔ عدم تشدد یعنی تمام مظالم کا جوانمردی سے مقابلہ، لیکن جواباً کسی پُر تشدد کارروائی سے گریز کرتے ہوئے۔

جب تک یہ انقلابی پارٹی خود کسی اقدام کی پوزیشن میں نہ آجائے اس وقت تک اس کی جانب سے یہ PASSIVE RESISTANCE لازم ہے۔ یہ دراصل چوتھا مرحلہ ہے جو پہلے مرحلے کے ساتھ ہی شروع ہو جاتا ہے۔

پانچواں مرحلہ اس وقت شروع ہوتا ہے جب یہ اندازہ ہو کہ ہمارے پاس طاقت ہے اور اب ہم کوئی ایسے

RESISTANCE کہتا ہوں۔ یہ کام کس طرح ہوگا اس کا فیصلہ در پیش حالت کی روشنی میں کیا جائے گا۔ میں اس کو یوں تعبیر کرتا ہوں کہ اس نظام کی کوئی دکھتی رگ چھیڑی جائے کیونکہ اب اقدام کرنا آپ کا کام ہے اور جس طرح پورا انسانی جسم ایک حیاتیاتی اکائی ہے اور کسی بھی عضو کو تکلیف پہنچے تو پورا جسم اسے محسوس کرتا ہے، اسی طرح پورا معاشرہ بھی ایک اکائی ہے۔ اس کی کسی بھی دکھتی رگ کو چھیڑنے کا مطلب پورے معاشرے کو چیلنج کرنا اور اس کی جانب سے ردِّ عمل کو دعوت دینا ہے۔ اس وقت دیکھنا یہ ہوگا کہ کون سے ایشو کو لے کر میدان میں آیا جائے اور اس پر مزاحمت شروع کی جائے۔ اس طرح کی مزاحمت کے جو طریقے بھی اس دور میں تمدنی ارتقاء کے نتیجے میں سامنے آتے ہیں وہ ہیں ڈیمانسٹریشن، ایجی ٹیشن، پکٹنگ وغیرہ۔ یہ سارے طریقے جو تمدن کے ارتقاء نے فراہم کیئے ہیں، اس مرحلے میں اختیار کئے جا سکتے ہیں۔

جب تک یہ دور نہیں آیا تھا اس وقت تک ریاست اور حکومت کے درمیان فرق نہیں کیا جاتا تھا۔ اگر کوئی شخص حکومت کو بدلنے کے لیے اٹھتا تھا تو باغی قرار پاتا تھا اور باغی واجب القتل تھا۔ اب ہم اس دور میں آچکے ہیں جس میں ریاست ایک علیحدہ حقیقت ہے اور حکومت ایک علیحدہ حقیقت۔ حکومت دراصل ریاست کا ایک انتظامی ادارہ ہے جسے بدلنے کا حق عوام کو حاصل ہے۔ اس اصول سے ہمیں ایک سہولت حاصل ہوگئی ہے کہ کوئی شخص اگر اس مقصد کے لئے اٹھتا ہے تو وہ باغی قرار نہیں پاتا۔ اور چونکہ مسلح کشمکش والی بات بھی اب ایک حد تک بعید از امکان ہوگئی ہے یعنی اس کا امکان اگرچہ بالکل ختم نہیں ہوا مگر بہت کم رہ گیا ہے۔ اس لئے اس کا بدل یہ ہے کہ کسی بھی ایشو پر میدان میں آکر مقابلہ کیا جائے۔

انقلاب کا یہ پورا خاکہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت سے اخذ کیا ہے۔ اگرچہ یہ گفتگو کسی حوالے کے بغیر ہو رہی ہے مگر بین السطور آپ محسوس کر رہے ہوں

کے ساتھ یہ بتانا چاہتا ہوں کہ حضورؐ نے انقلابی عمل کے اس مرحلے میں ڈائریکٹ ایکشن کیسے کیا تھا۔

حضورؐ نے مدینہ پہنچ کر چھ ماہ صرف اندرونی استحکام پر توجہ صرف کی۔ اس عرصے میں مسجد نبوی تعمیر کی۔ مواخات بین المہاجرین والانصار کا اہتمام فرمایا اور تیسرے یہ کہ یہودیوں سے معاہدے کر کے انھیں پابند کر دیا کہ وہ مسلمانوں کے خلاف کسی جارحیت کا ارتکاب نہیں کریں گے، اور بیرونی حملے کی صورت میں مشترکہ دفاع کیا جائے گا۔ اس کے فوراً بعد آپ نے ڈائریکٹ ایکشن کا آغاز کیا، جو یہ تھا کہ آپؐ نے چھاپہ مار دستے بھیجنے شروع کر دیئے۔ بدر سے پہلے پہلے اسی ۸ مہمات تاریخ کے ریکارڈ پر ہیں۔ ان میں سے جن میں آپؐ خود تشریف لے گئے وہ غزوات اور دوسرے سرایا کہلاتی ہیں۔

ان مہمات کا مقصد قریش کا پولیٹیکل آئسولیشن اور مکہ کی معاشی ناکہ بندی تھا۔ حضورؐ جہاں تشریف لے جاتے وہاں کسی قبیلے سے صلح کرتے یعنی اسے حلیف بنا لیتے۔ یہ قبائل پہلے قریش کے حلیف تھے حضورؐ سے معاہدے کے بعد یا تو وہ قریش کے حلیف نہیں رہتے تھے یا دونوں کے حلیف بن جاتے تھے۔ پہلی صورت میں تو آپؐ کی کامیابی بہت واضح ہوتی، اور دوسری صورت میں کم از کم یہ ہوتا کہ یہ قبائل مسلمانوں اور قریش کے درمیان غیر جانبدار ہو جاتے اور ان کی جانب سے جارحیت کا خطرہ باقی نہ رہتا۔ ان کوششوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ قریش کا دائرہ اثر سمٹتا چلا گیا اور وہ سیاسی طور پر الگ تھلگ ہوتے چلے گئے۔

مکے کی معاشی ناکہ بندی کے لئے رسول اللہؐ نے قریش کی تجارتی شاہراہوں کی جانب چھاپہ مار دستے بھیجے جس کے نتیجے میں ان کی جانب سے ردِ عمل ہوا اور اس طرح تحریک ACTIVE RESISTANCE کے مرحلے میں داخل ہو گئی۔

سیرت نبویؐ کے اس مطالعہ کی روشنی میں تحریک کو اس مرحلے تک پہنچانے کا جو طریقہ کار میں اب تک سمجھ سکا ہوں وہ یہ ہے کہ حدیث کی اصطلاح کے مطابق نَہی عَن المُنکَر بالیَد یعنی برائی کو ہاتھ سے، طاقت سے مٹانے کا آغاز کیا جائے۔ اس کے لئے ہمیں معاشرے میں رائج کسی بھی منکر کو سنگل آؤٹ کرنا ہوگا اس احتیاط کے ساتھ کہ وہ محض اہل علم ہی کے سمجھنے کی بات نہ ہو بلکہ عوام کے احساسات بھی اس سے وابستہ ہو رہتا کہ ان کی حمایت کسی نہ کسی درجے میں آپ کو حاصل ہے۔

اس طرح آپ اس طاقت کو چیلنج کریں گے جو اس منکر کو فروغ دے رہی ہے، نظام کو چلا رہی ہے۔ ظاہر ہے آج کے دور میں یہ طاقت حکومت ہی ہوتی ہے۔ آپ اسے چیلنج کریں گے کہ ہم اب اس کام کو نہیں ہونے دیں گے۔ اس سے پہلے یہی جدوجہد نہی عن المنکر باللسان کے طور پر کی جاتی رہی ہوگی۔ لیکن اس مرحلے میں برائی کے خاتمہ کے لئے طاقت کا استعمال شروع ہوگا۔ اس مقصد کے لئے دورِ حاضر میں رائج مختلف طریقے مثلاً احتجاجی مظاہرے، جلوس، جلسے، پکٹنگ، سڑکوں پر دھرنا دیکر بیٹھ جانا وغیرہ، اختیار کئے جائیں گے۔ لیکن یہ سب ہوگا بالکل پرامن، اس اہتمام کے ساتھ کہ اپنے ہاتھ سے کسی انسان کو یا کسی پبلک پراپرٹی کو کوئی نقصان نہ پہنچنے دیا جائے۔ جب تک اس بات کا اطمینان نہ ہو جائے کہ اس انداز کی پرامن تحریک شروع کی جا سکتی ہے اور جاری رکھی جا سکتی ہے، اس وقت تک سڑکوں پر آیا ہی نہ جائے گا۔ اتفاقی طور پر کوئی حادثہ ہو جائے تو بات الگ ہے لیکن اس مرحلے میں داخلے کا فیصلہ کرتے ہوئے ان امور کو پوری طرح ملحوظ رکھا جائے گا۔

اب اس کا نتیجہ بالفرض اگر یہ ہوا کہ حکومت وقت ہمارے مطالبے کو مان لے تو فبہا۔ ایک کے بعد دوسرے اور دوسرے کے بعد تیسرے منکر کے خلاف جدوجہد جاری رہے گی۔ اگر حکومت تسلیم کرتی گئی تو میرے نزدیک اسی پر امن سے اسلام آجائے گا۔ لیکن اگر وہ ایسا نہیں کرتی، جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے، کہ حکومتیں ان معاملات کو اپنی انا کا مسئلہ بنا لیتی ہیں، تو پھر وہ لاٹھیاں برسائے گی، گولیاں چلائے گی۔ اب اگر انقلابی پارٹی نے واقعتاً دعوت، تنظیم اور تربیت کے مراحل صحیح طور پر طے کر رکھے ہوں تو اس کے وابستگان اس راہ میں سختیاں برداشت کریں گے اور اپنی جانیں دیں گے۔ لیکن اس دور میں یہ چیز ایک حد تک ہی ہو سکتی ہے کیونکہ اب مسلم دنیا پر غیر ملکی آقاؤں کی حکومت نہیں ہے، ایسی فوجوں کا قبضہ نہیں ہے۔ ہماری افواج ہیں، وہ کب تک لوگوں کو ماریں گی۔ حالات لازماً تبدیل ہوں گے اور وہ پالیسی جس نے یہ سارا کام کیا ہے ایک اور رخ اختیار کرے گی۔

س:۔ ڈاکٹر صاحب، اس میں ایک الجھن ہے اور وہ یہ کہ انبیاء کے زمانوں میں تو فریق صرف دو ہوتے تھے ایک وقت کا اقتدار اور ایک اللہ کا نبی۔ جبکہ ہمارے زمانے میں مختلف طاقتیں سرگرم عمل ہیں۔ اب اگر آپ اپنی اسکیم کی [illegible]

مولانا مودودیؒ بھی نظامِ بیعت کے حامی تھے لیکن بعض علماء کی جانب سے اختلاف کے اندیشے کی وجہ سے انہوں نے یہ طریقہ اختیار نہیں کیا

بہت سی دوسری قوتوں کے کود پڑنے کا امکان پایا جاتا ہے۔ اس وقت آپ کس طرح اس بات کا اہتمام کریں گے کہ آپ کی تحریک آپ ہی کے ہدف کی طرف چلتی رہے اور دوسرے آپ کے کام کو غیر موثر بنا کر نہ رکھ دیں؟

ج:۔ اس میں پہلی بات تو یہ ہے کہ ہم اس مرحلے کا آغاز اسی وقت کریں گے جب ہمیں اطمینان ہو جائے گا کہ اب ہم اسے سنبھال سکتے ہیں۔ پھر بھی کوئی اتفاقی حادثہ ہو سکتا ہے، اس امکان کو مسترد نہیں کیا جا سکتا۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس پروسس کے دوران یقیناً ایک پولرائزیشن ہوگی اس وقت جو پولرائزیشن ہو رہی ہے دین اس میں بنیادی ایشو نہیں ہے۔ دینی قوتیں اطراف میں ہیں۔ لیکن یہ تحریک جاری رہی تو پھر دین کی بنیاد پر پولرائزیشن ہوگی۔ اگر ہماری دعوت میں اتنی جان بھی نہ ہو کہ دینی جماعتوں سے لوگوں کو کھینچ کر لا سکے تب تو کسی کامیابی کی توقع ہی فضول ہے۔ لیکن اگر دعوت واقعی جاندار ہے تو لوگ آئیں گے۔ دینی جماعتوں کی قیادتوں سے تو کوئی خاص توقع نہیں کی جا سکتی کیونکہ ان کی چودھراہٹوں کا معاملہ ہے مگر کارکنوں میں سے لوگ ضرور ملیں گے۔ اور انقلاب اسی وقت آئے گا جب ایک قیادت ابھر کر سامنے آئے اور دوسری قیادتیں یا تو ختم ہو جائیں یا اس کے تابع ہو جائیں۔ جب ایسا ہو جائے گا تو وہ خطرات باقی نہیں رہیں گے جن کا ذکر آپ نے کیا ہے۔

س:۔ پاکستان کے موجودہ حالات میں آپ اس کے امکانات کس حد تک محسوس کرتے ہیں؟

ج:۔ بظاہر کوئی امکان نظر نہیں آتا۔ لیکن ہم قدرتِ خداوندی اور نصرتِ خداوندی کے بھروسے پر کام کر رہے ہیں۔ اللہ کی مشیت سے حالات میں اچانک کوئی ایسا موڑ آ سکتا ہے جو ہمارے سان گمان میں بھی نہ ہو۔ سیرتِ نبویؐ میں یہ موڑ ہمیں ۱۰ نبوی میں، ہجرت سے تین سال پہلے نظر آتا ہے۔ مکے میں دس برس تک دعوت دینے کے باوجود حضورؐ کے کام کے نتائج نہایت حوصلہ شکن ہیں۔ آپؐ کے قتل کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ آپؐ نئے مرکز کی تلاش میں طائف

جو مکے میں دس برس میں ذاتی طور پر آپؐ کے ساتھ نہیں ہوا تھا۔ واپس آتے ہیں تو مکے میں داخلے کے لئے ایک کافر مطعم بن عدی کی پناہ طلب کرتے ہیں۔ پھر وہ اپنے چھ بیٹوں کے ساتھ مسلح ہو کر آپؐ کو اپنی پناہ میں لے کر مکے میں داخل ہوتا ہے۔ بتلایئے ان حالات میں کہیں کوئی امید نظر آتی ہے۔

لیکن چند مہینے بعد مدینے کے ۶ افراد ایمان لے آتے ہیں۔ اگلے سال ۱۲ ہو جاتے ہیں۔ اس کے اگلے سال ۷۲ ہو جاتے ہیں اور بالآخر مدینے میں اسلامی ریاست کے قیام کی راہ ہموار ہو جاتی ہے۔ اس لئے میں کہتا ہوں کہ اللہ کی مشیت جب چاہے حالات کا رخ موڑ سکتی ہے، ہمارا کام کوشش کرتے رہنا ہے۔

س:۔ آپ نے جو مثال دی ہے اس میں بس ایک ہی طاغوت ہے کہ وہاں تو بس دو ہی متحارب گروہ تھے مزید سیاسی گروہ بندیاں نہیں ملتیں جبکہ موجودہ صورتحال اس سے بہت مختلف ہے؟

ج:۔ میں نے یہ مثال تو دراصل مایوسی کے حوالے سے دی ہے کہ تاریک سے تاریک حالات میں بھی اللہ کی مشیت امید کی روشنی اور کامیابی کی شکل پیدا کر سکتی ہے۔ ورنہ جہاں تک اس دور میں دیگر سیاسی گروہوں اور متحارب طاقتوں کا تعلق ہے تو ایسا نہیں ہے کہ وہ بس دو تک ہی محدود ہوں۔ مدینے پہنچ کر حضورؐ کو کم سے کم تین محاذوں پر مقابلہ کرنا پڑا۔ ایک طرف یہود اور ان کی ریشہ دوانیاں تھیں۔ وہ کھلم کھلا دشمن نہیں تھے۔ انہوں نے کبھی کھل کر آپ کا مقابلہ نہیں کیا اور نہ کبھی آپ سے کھلے میدانوں میں مقابلہ نہیں کریں گے۔ دوسرے اندر سے خود ایک نفوذ کا لسٹ عنصر پیدا ہو چکا تھا یعنی منافقین اور تیسرے باہر کے کھلے دشمن تھے۔ یعنی حضورؐ کے مقابلے میں ایک نہیں تین گروہ تھے قریش، یہود اور منافق۔ اس لئے یہ سمجھنا درست نہیں کہ اس دور میں رسول اللہ کو بس ایک ہی محاذ کا سامنا تھا اور کشمکش دو ہی طاقتوں کے درمیان تھی۔

لیکن اب چونکہ امت میں انتشار کا موضوع چھڑ گیا ہے۔ اس لیے اسی حوالے سے ایک سوال ہے اور وہ یہ کہ قرآن نے ہمیں ایک ہی امت قرار دیا ہے، بلکہ قرآن تو تمام ہی انسانوں کو ایک امت بتاتا ہے کان الناس امۃ واحدۃ، اسی طرح اللہ نے ہر دور میں ایک ہی دین اپنے نبیوں کے ذریعے بھیجا اور اس کے ماننے والوں کا نام کسی تفریق کے بغیر مسلم قرار دیا۔ قرآن کے الفاظ میں ھُوَ سَمّٰکُمُ المسلمین من قَبْلُ وَفِی ھٰذا۔ لیکن جو کچھ ہمیں اپنی تاریخ میں نظر آتا ہے، وہ یہ ہے کہ جو جماعت بھی امت میں لوگوں کو اللہ کے دین کی طرف بلانے کے لئے اٹھی، بالآخر نتیجہ یہ نکلا کہ اس کے وابستگان اپنے داعی کی شخصیت سے عقیدت کے غلو میں مبتلا ہوئے اور اس جماعت نے آخر کار ایک علیحدہ گروہ اور فرقے کی شکل اختیار کر لی۔ اس طرح امت میں اتحاد کے بجائے مستقل نوعیت کی ایک نئی تقسیم وجود میں آگئی، انتشار کی ایک نئی شکل پیدا ہو گئی۔ جبکہ انبیاء کا طریق کار یہ رہا ہے کہ انہوں نے کبھی اللہ کے دین کو اپنی ذات سے منسوب نہیں کیا۔ یہودی اور عیسائی سب بعد کی پیداوار ہیں۔ لیکن ہمارے ہاں جتنے بھی لوگ اس کام کے لئے کھڑے ہوتے ہیں ان کے معتقدین عموماً ان کی زندگیوں ہی میں شخصیت پرستی کے روگ میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ آج کے دور میں بھی جتنی دینی جماعتیں ہیں، اس سے پہلے جتنی جماعتیں وجود میں آئیں، جتنے مسلک بنے، سب اسی طرح سے بنے۔ آپ بھی جو کام کر رہے ہیں اس میں بھی اس بات کا پورا امکان پایا جاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس صورتحال سے کس طرح نجات مل سکتی ہے اور مزید گروہوں میں تقسیم کے بجائے واعتصموا بحبل اللہ کی کیفیت کس طرح پیدا ہو سکتی ہے؟

ج:- انتشار امت کے معاملے میں آپ کا مشاہدہ بالکل صحیح ہے۔ جو بھی اصلاحی تحریک اٹھی، ظاہر ہے وہ کسی نہ کسی فرد کی کوشش سے شروع ہوئی کیونکہ افراد کے ہاتھوں

ایسی اسلامی تحریک جس میں آزادیٔ فکر و اظہار پر کوئی قدغن نہ ہو، بیعت کے نظام کے تحت ہی قائم ہو سکتی ہے۔

کوئی نہ کوئی شخص آگے بڑھ کر اس کام کا آغاز کرے گا۔ اسی طرح اس سے بھی کوئی مفر نہیں ہے کہ جو لوگ اس کے دست و بازو بنیں گے وہ اس کی شخصیت کی کشش اور اس سے محبت و تعلق کی ہی بنیاد پر اس کے گرد جمع ہوں گے۔ قائد کے کاز سے وابستگی کے ساتھ ساتھ خود اس کی ذات سے تعلق خاطر اس مقصد کے لیے بالکل ضروری ہے۔ یہ دونوں چیزیں کسی بھی تحریک کی کامیابی کے لیے لازم ہیں اور اس میں واقعتاً یہ خطرہ موجود ہے کہ فوری طور پر، یا کچھ عرصے کے بعد، وہ علیحدہ تشخص کے ساتھ ایک الگ فرقے یا جماعت کی شکل اختیار کر لے۔ یہ خطرہ بلاشبہ موجود ہے اور میں اس کو تسلیم کرتا ہوں۔ لیکن آج تک کسی مجدد امت نے اور کسی دینی خادم نے اس خطرے کی وجہ سے کام کرنا نہیں چھوڑا۔ حالانکہ جو مشاہدہ آج ہمیں ہو رہا ہے، ممکن ہے وہ ابتدائی ایک دو صدی کے لوگوں کو نہ ہوا ہو لیکن ان کے بعد ان تحریکوں کا جو نتیجہ اس شکل میں نکلا وہ سب کے سامنے تھا۔ یعنی خالص خیر کے لیے بننے والی جماعتوں سے بھی فرقے وجود میں آگئے۔ اس صورتحال میں، میں سمجھتا ہوں کہ اس خطرے کی موجودگی کے باوجود اصلاحی تحریکوں کا برپا کیا جانا ضروری ہے اور اس خطرے سے ان کی ضرورت کی نفی نہیں ہوتی۔ اس لیے کہ اس کام میں خیر کا پہلو خطرے کی نسبت سے زیادہ ہے۔

اب رہ گیا یہ سوال کہ اس خطرے سے بچنے کی کیا احتیاطی تدابیر ہو سکتی ہیں جنہیں اختیار کیا جانا چاہیے۔ اس مقصد کے لئے سب سے پہلی بات جو ضروری ہے وہ یہ ہے کہ شخصیتوں کو ابھارنے کے لئے کسی مصنوعی عنصر کا استعمال نہ کیا جائے۔ اگر کسی شخص میں واقعی اتنی صلاحیت ہے اور حقیقتاً وہ اتنا عظیم ہے تو آپ اسے کب تک چھپائیں گے۔ سورج کو کب تک غلافوں میں لپیٹ کر رکھا جا سکے گا لیکن اس میں کوئی مصنوعی عنصر نہیں ہونا چاہیئے یہ پہلی احتیاط ہے

کوشش کرے کہ اس کی ذات سے عقیدت میں غلو اس کے ساتھیوں اور متبعین میں پیدا نہ ہونے پائے۔ مثال کے طور پر حضورؐ کے سامنے ایک صحابی نے کہہ دیا کہ "ماشاءاللہ و شئت" یعنی جو اللہ چاہے اور جو آپ چاہیں۔ آپ نے اس بات پر فوراً ٹوک دیا اور فرمایا "کیا تم نے مجھے اللہ کا مدِمقابل سمجھ لیا ہے؟" یعنی مشیت صرف اللہ کی ہے حضورؐ کی زندگی میں یہ احتیاط برابر کارفرما نظر آتی ہے۔ آپ زمین پر بیٹھ کر کھانا کھاتے اور فرماتے بندہ ہوں، بندے کی طرح کھاتا ہوں۔ قرآن بھی وضاحت کرتا ہے کہ نبی بھی تمہارے ہی جیسا بشر ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ اس پر وحی نازل ہوتی ہے۔

ان دو احتیاطوں کے علاوہ تیسری چیز اس بات کی کوشش ہے کہ اس جماعت کے اندر ایک سیکنڈ لائن ایسے افراد کی ابھر کر سامنے آئے جن کی وفاداری و وابستگی تحریک کے نظریے سے، شخصی وابستگی و تعلق کے مقابلے میں بالا و برتر ہو۔ عوام کے اندر تو یہ نہیں ہوتا۔ عوام کی صفوں سے آپ کو کارکن چاہیئں۔ ان کے لئے اگر آپ یہ قدغن لگا دیں گے تو آپ کی رفتار سست ہو جائے گی لیکن پارٹی کے اندر قیادت کی صفوں میں اس کا اہتمام کیا جانا چاہیئے۔

ان تین احتیاطی تدابیر کے ساتھ کام کو چلانا چاہیئے کیونکہ یہ کام بہرحال فرض ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ جس طرح قرآن میں شراب اور جوئے کے بارے میں آیا ہے کہ اس میں لوگوں کے فائدے کی نسبت نقصان زیادہ ہے اسلئے یہ حرام ہے۔ اسی طرح اس زیر بحث مسئلہ میں اگر چہ مضرت کا پہلو بھی ہے لیکن اس کی افادیت مضرت کی نسبت زیادہ ہے اس لئے یہ کام کیا جانا چاہیئے۔

س:- قرآن نے تفرقے کا جو سبب بتایا ہے اس کے لئے "بغیاً بینھم" کے الفاظ استعمال کئے ہیں یعنی لوگوں میں تفرقہ ہمیشہ ایک دوسرے پر زیادتی کرنے اور اپنی برتری قائم کرنے کے جذبے کی وجہ سے رونما ہوا۔ اب سوال یہ ہے کہ اس امت میں جو تفرقے ہوئے یا آج ہیں یا آئندہ ہوں گے کیا ان کا سبب بھی یہی نہیں ہے؟

ج:- یہ اصل میں دو الگ الگ باتیں ہیں۔ ایک ہے تفرقہ اور اس کے اسباب اور ایک ہے شخصیت پرستی کا معاملہ۔ میں نے اپنی گفتگو صرف شخصیت پرستی کے موضوع تک

اب جہاں تک تفرقہ کا تعلق ہے تو آپ نے بالکل صحیح حوالہ دیا ہے کہ متعدد مقامات پر قرآن نے تفرقے کا سبب یہی "بغیاً بینھم" بتایا ہے۔ تفرقہ جب بھی ہوتا ہے اسی بناء پر ہوتا ہے۔ جدید سائیکالوجی کی ایک اصطلاح اس "بغیاً بینھم" کے بہت قریب پہنچ گئی ہے اور وہ ہے THE URGE TO DOMINATE ایڈلر کے فلسفے میں انسان کا بنیادی داعیہ اسی کو بتایا گیا ہے۔ اگرچہ میں اس سے اتفاق نہیں ہے تاہم جس طرح فرائڈ کے ہاں جنس ہے، مارکس کے ہاں معاش ہے اسی طرح ایڈلر کے ہاں THE URGE TO DOMINATE ہے تو اس میں کوئی شک نہیں کہ تفرقے کا سبب یہی جذبہ بنتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ تفرقہ کیا ہوتا ہے۔

تفرقہ یہ ہے کہ آپ ایک چیز کو حق سمجھنے کے باوجود قبول نہ کریں۔ تفرقے کی جڑ یہ ہے اصل میں۔ البتہ اگر آپ کسی مغالطے اور غلط فہمی کی وجہ سے کسی چیز کی مخالفت اسے غلط سمجھ کر کر رہے ہیں خواہ اصلاً وہ حق ہی ہو، تب یہ تفرقہ شمار نہیں ہوگا۔ تفرقے کا آغاز یہاں سے ہوتا ہے کہ کسی چیز کی صداقت پر آپ کا دل مطمئن ہو اور گواہی دے۔ لیکن آپ صرف اپنی انانیت کی وجہ سے اسے تسلیم نہ کریں۔ اس کی سب سے بڑی مثال قرآن مجید میں یہود کی دی گئی ہے۔ وہ جانتے تھے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے نبی ہیں۔ قرآن مجید کے الفاظ میں "یعرفونہ کما یعرفون ابناءھم" وہ نبی کو ایسے پہچانتے ہیں جیسے اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود انہوں نے سب سے بڑھ کر مخالفت کی۔

بہرحال برتری قائم کرنے اور رکھنے کا یہ جذبہ شخصیت پرستی کے ساتھ مل کر تفرقہ بندی کا سبب بن جاتا ہے۔ یہ دو چیزیں جو الگ الگ ہیں ایک دوسرے کو سہارا دیتی ہیں۔ یعنی جن لوگوں کو اپنی انانیت کی وجہ سے تفرقہ میں مبتلا ہونا ہی ہے وہ کسی شخصیت کی آڑ لے کر اور اسے بلڈ اپ کر کے ایک فرقے کی شکل دے دیتے ہیں۔

س:- اس میں اک ذرا سا فرق یہ ہے ڈاکٹر صاحب کہ اللہ کا نبی جو بات کہتا ہے وہ تو وحی کے ذریعے آتی ہے وہ اسی حوالے سے اسے پیش کرتا ہے اس لئے وہاں تو اختلاف کی گنجائش ہی نہیں ہوتی۔ لیکن اس سے ہٹ کر متنے بھی

ٹی وی پروگرام "الھدیٰ" پر پابندی
کیوں لگی ؟ کِس نے لگوائی ـــــ ؟

س :۔ ٹیلی ویژن پر آپ کے پروگرام "الہدیٰ" سے ایک ایسا طبقہ مستفید ہورہا تھا جس تک عام طور پر قرآن کا پیغام نہیں پہنچ پاتا ہے ۔ یہ سلسلہ کیوں اور کس طرح بند ہوا اور اس کی ذمہ داری خود آپ پر کس حد تک عائد ہوتی ہے ؟

ج :۔ مجھے آن دی ریکارڈ اب تک یہ معلوم ہی نہیں ہے کہ اس بندش کا سبب کیا ہے ۔ کس وجہ سے یہ پروگرام بند کیا گیا ۔ کس نے بند کیا ۔ کس سطح پر یہ فیصلہ ہوا ۔ یہ میرے علم میں نہیں ہے ، اس لیے میں اس سوال کا کوئی واضح جواب آپ کو نہیں دے سکتا ۔ البتہ یہ احساس مجھے ضرور ہے کہ اس ذریعے سے قرآن سے جو دلچسپی اور لگاؤ عام ہو رہا تھا ، کوئی اور اتنا مؤثر ذریعہ ہمارے پاس نہیں ہے جس سے یہ کام لیا جاسکے ۔ جہاں تک یہ تاثر ہے کہ اس کی بندش میں میرا بھی حصہ ہے تو ایسی کوئی بات نہیں ۔ میری طرف سے تو پیشکش تھی کہ میں اس پروگرام کا کوئی معاوضہ بھی نہیں لینا چاہتا ، لیکن انہوں نے کہا کہ یہ ہماری قانونی ضرورت ہے ، اس کے بغیر پروگرام دیا ہی نہیں جاسکتا ۔ اس کے بعد میں نے ضیاء صاحب کو خط بھی لکھا تھا کہ میں اس کا کوئی معاوضہ نہیں لینا چاہتا ۔ اگر آپ اس کا وقت نہیں بڑھا سکتے تو ہفتے میں دو مرتبہ کر دیجئے ۔ بہرحال اس کے بند ہونے سے جو نقصان ہوا اسے میں محسوس کرتا ہوں اور جس کی وجہ سے بھی بند ہوا ، اللہ کے ہاں اس سلسلے میں اس پر بھاری ذمہ داری عائد ہوگی ، اور اسے اس کی جواب دہی کرنی ہوگی ۔

نہیں ہوتا ۔ لہٰذا ان سے اختلاف کرتے ہوئے ایک صورت یہ بھی پیش آسکتی ہے کہ جیسے ایک آدمی حق سمجھ رہا ہے اسے دوسرا آدمی حق نہ سمجھ رہا ہو ، اور اس کا سبب دونوں کے فہم و شعور کا اختلاف ہو ۔ تو اس صورت میں تو وہ شکل پیدا نہیں ہوتی جو کسی نبی سے اختلاف کی صورت میں ہوتی ہے ۔ کیونکہ نبی تو مامور من اللہ ہوتا ہے اس کے بعد لوگ اس سے اختلاف کرتے ہیں تو نوعیت بدل جاتی ہے ۔ لیکن عام حالات میں اگر ایک آدمی دوسرے کے دلائل سے مطمئن نہیں ہوتا اور شرح صدر کے ساتھ سمجھتا ہے کہ اس کی بات درست نہیں ہے تو اس سے اختلاف کی ایک دوسری صورت پیدا ہوتی ہے ۔ اس بارے میں آپ کا کیا خیال ہے ؟

ج :۔ اس میں دو عوامل ہیں ۔ ایک تو یہ کہ نبوت تھی ہدایت کے لئے ۔ نبوت کا سلسلہ ختم ہو گیا لیکن ہدایت کا تو کوئی نہ کوئی سلسلہ قائم ہے ۔ اس کے لئے آپ کی بیان کردہ دونوں صورتوں میں بنیادی فرق نہیں ہوگا ۔ اللہ تعالیٰ جو بھی انتظام کرے اس کے تحت لوگوں کے اوپر ایک دفعہ انکشاف حق کرتا ہے تب حجت قائم ہوتی ہے ۔ آخری درجے میں قیام حجت کا ذریعہ نبوت تھی ۔ لیکن اب بھی اگر آپ انفرادی

شے کی حقانیت آدمی کو ایک جھلک دکھا دیتی ہے ۔ اس کے بعد آدمی کے اخلاص کا امتحان ہوتا ہے کہ وہ صداقت کو مانتا ہے یا نہیں ۔ لہٰذا اس دور میں بھی کوئی دعوت حق بلند ہوگی تو جلد یا بدیر مختلف لوگوں کے اوپر وہ مرحلے آئیں گے کہ حقیقت انہیں اپنی جھلک دکھائے گی ۔ یہ میں اپنے بارے میں نہیں کہہ رہا ہوں اصولی بات ہو رہی ہے کہ طریق نبوی کے مطابق کوئی بھی دعوتِ حق برپا ہو تو اس کے ذریعے لوگوں پر حق کی حجت بہر حال تمام ہوگی ۔

دوسری بات یہ کہ جب ایک دعوت شروع ہوتی ہے تو وہ چونکہ ایک متحرک چیز ہے اس لیے وہ رفتہ رفتہ اپنے اثرات قائم کرے گی اور جس طرح میں نے پہلے عرض کیا کہ پھر معاشرے میں پولرائزیشن کا عمل ہوگا ۔ جن جن پر حق کا انکشاف ہوتا جائے گا وہ اس دعوت کے ساتھ شامل ہوتے چلے جائیں گے اور جن کے دلوں میں سختی ہوگی وہ روز بروز بڑھتی چلی جائے گی اور بالآخر وہ اس دعوت کے مقابلے میں آجائیں گے ۔ یہ عمل ایک وقت لے گا لیکن اس عرصے میں حق سے تعلق ، ہمدردی اور وابستگی رکھنے والے ایک مرکز پر جمع ہوتے جائیں گے ، اور ہر طرف سے کٹ کٹ کر اس دعوت سے جڑتے جائیں گے جس کے نتیجے میں بالآخر حق و باطل کی دو واضح

بنی ہوں، وجود میں آجائیں گی اور پھر ان کا دو بدو مقابلہ ہوگا۔ جب تک یہ نہ ہو انقلاب کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

س:۔ ذاکٹر صاحب، اس معاملے میں الجھن یہ ہے کہ پوائنٹ آف ریفرنس تو مشترک ہے، مثلاً آپ کا پوائنٹ آف ریفرنس وہی ہے جو مولانا مودودیؒ کا ہے یا جو مولانا امین احسن اصلاحی یا مولانا وحید الدین خاں کا ہے۔ ہمارا اعتبار اسی دین کے حوالے کی وجہ سے آپ پر بھی ہے اور ان دوسرے افراد پر بھی۔ لیکن یہ تمام حضرات بعض مسائل کے بارے میں جو نتائج اخذ کرتے ہیں وہ مختلف ہوتے ہیں۔ اب ایک الجھن یہ پیدا ہوتی ہے کہ ایک ہی حوالے سے آنے والی ان مختلف تعبیرات کی صورت میں آدمی کہاں جائے جبکہ اس کے نزدیک یہ سارے ہی لوگ اپنی دیانت، اخلاص، اور کردار کی بناء پر اس کے نزدیک یکساں طور پر محترم اور قابلِ اعتماد ہیں، اس دشواری کا کیا حل ہے؟

ج:۔ پہلی بات تو یہ کہ آپ نے اس سوال کو بہت محدود کر دیا ہے۔ آپ جن حلقوں کو لے رہے ہیں وہ دراصل ایک ہی حلقہ ہے ورنہ یہ مسئلہ اس سے کہیں زیادہ گھمبیر ہے۔ مجھ سے ایک مرتبہ لاہور میں ایک طالب علم نے سوال کیا کہ ایک درس قرآن آپ دیتے ہیں، ایک مولانا مودودیؒ دیتے ہیں، ایک پرویز صاحب دیتے ہیں، ایک فلاں مولوی صاحب دیتے ہیں تو اب آخر کس کی بات کو درست مانیں۔ تو معاملہ یہ ہے کہ یہ مسئلہ درحقیقت بہت وسیع ہے۔ یہاں صوفیاء کے مختلف طبقے ہیں، تبلیغی جماعت ہے۔ علماء کی مختلف تنظیمیں ہیں۔ مختلف دینی مدارس کے لوگ ہیں اور ایک شخص کو ان سب کے افکار سے سابقہ پیش آتا ہے۔

بہرحال اس طالب علم کو میں نے اس وقت جو جواب دیا تھا وہ یہ تھا کہ بھائی اگر قرآن یا دین کوئی سینہ بسینہ علم ہوتا، کوئی کھلی کتاب نہ ہوتی، کوئی کھلا دین نہ ہوتا یا عربی کوئی مردہ زبان ہوتی جسے سیکھنے کے لئے کہیں سات سمندر پار جانا ضروری ہوتا اور جان جوکھوں میں ڈالنی پڑتی، تب تو آپ کا سوال درست ہوتا اور آپ کی مشکل حقیقی مشکل ہوتی۔ لیکن خوش قسمتی سے ایسا ہے نہیں۔ عربی زندہ زبان ہے قرآن عربی مبین میں ہمارے سامنے موجود ہے اس لئے قرآن و سنت کا خود مطالعہ کیجئے اور دیکھئے کہ کس کی بات کس معاملے میں [illegible]

کہاں تک نہیں ہے۔ میرے نزدیک اس مسئلہ کا حل یہ ہے کہ لوگ اپنی آنکھیں بند رکھنے اور اندھے کی طرح اپنی لاٹھی دوسرے کے ہاتھ میں دینے کے بجائے لنگر لنگوٹ کس کر خود میدان میں اتریں، دین کا علم حاصل کریں اور پھر دیکھیں کہ کس معاملے میں کس کی دلیل مضبوط اور کس کا موقف قرآن و

> اسلامی تحریک تبلیغ تنظیم اور تربیت کے مراحل سے گزر کر جب تک نظامِ باطل سے دوبدو مقابلہ کی پوزیشن میں نہ آجائے اس وقت تک اسلامی انقلاب کا کوئی امکان رونما نہیں ہوتا۔

سنت کے مطابق ہے۔ پھر جس کی بات درست نظر آئے اسے فوراً قبول کریں اور اس کے دست و بازو بنیں۔ کیونکہ دعوتِ دین کی جدوجہد سے اپنے آپ کو علیحدہ رکھنے کے لئے یہ دلیل ہرگز درست نہیں ہے کہ اس کے علمبردار مختلف مکاتیب فکر میں بٹے ہوئے ہیں۔ آج آپ کو جس کی بات اپیل کر رہی ہے آج اس کا ساتھ دیجئے۔ آج کی تاریخ میں اس سے علیحدہ رہنا جائز نہیں ہے۔ البتہ آنکھیں کھلی رکھئے، کان کھلے رکھئے، دیکھتے رہیئے، سوچتے رہیئے اور خوب سے خوب تر کی جستجو میں رہیئے۔ جب کوئی اس سے بہتر نظر آئے تو اس کا ساتھ دیجئے۔

س:۔ اس میں ایک اور دشواری یہ ہے کہ آدمی کے لئے کلی اتباع کی صورت نہیں بنتی۔ مثلاً ایک شخص کو اپنے حد تک مطالعے اور تلاش و تحقیق کے بعد ایک معاملے میں آپ کی رائے صحیح نظر آتی ہے اور اس میں وہ آپ کے ساتھ چلنا چاہتا ہے۔ دوسرے معاملے میں کسی دوسرے صاحب علم کی رائے اس شخص کو اپنے فہم و شعور اور مطالعہ کی روشنی میں زیادہ صائب اور قابلِ ترجیح نظر آتی ہے اور کسی تیسرے معاملے میں کسی اور کی رائے اسے صحیح تر معلوم ہوتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ ایسی صورت میں وہ کیا کرے؟ کلی اتباع تو نبی ہی کی ممکن ہے جو اپنی تعلیم وحی الٰہی کی سند کے ساتھ پیش کرتا ہے لیکن نبی کے بعد ایک شخص کو جو یہ دشواری پیش آتی ہے

اس کا حل کیا ہے؟

ج :- بات بہت پیارے انداز میں آگے بڑھ رہی ہے، اور انشاءاللہ اس کے نتیجے میں بہت سی الجھنیں صاف ہوں گی۔

اس میں جو اصل مغالطہ ہے وہ مختلف مسئلوں کو یکساں اہمیت دے دینا ہے جبکہ صحیح بات یہ ہے کہ جہاں تک عملی اختلافات کا تعلق ہے تو اس بات میں ہرگز کوئی حرج نہیں کہ ایک شخص اپنی تلاش و تحقیق کی روشنی میں کسی معاملے میں ایک فرد کی رائے کو بہتر سمجھے اور اس کی پیروی کرے اور کسی دوسرے معاملے میں کسی دوسرے فرد کی رائے کو ترجیح دے۔ اس علمی اختلاف کو کسی تحریک کے راستے میں رکاوٹ نہیں ہونا چاہیئے۔

فیصلہ جس بات میں کیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ دعوت کس کی صحیح ہے۔ کس کا طریق کار بنیادی طور پر درست ہے۔ اس میں بھی سو فیصد اتفاق ضروری نہیں ہے۔ آنکھیں اور کان اور دل و دماغ کے دروازے اس میں بھی کھلے رکھنے ضروری ہیں۔ اندھی تقلید تو دراصل تحریک کو اپنے ہی ہاتھوں دفن کر دینے کے مترادف ہے۔ فیصلہ صرف یہ کرنا ہوگا کہ کس کی دعوت کا اساسی خاکہ درست ہے۔ طریق کار کے بنیادی اصول صحیح ہیں اور تیسرے یہ کہ کس کی شخصیت پر اپنی امکانی حد تک تحقیق کے بعد سب سے زیادہ اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ اس حد تک اتفاق ہو تو پھر ایسے شخص کا ساتھ دینا چاہیئے لیکن اس کے ساتھ علمی مسائل میں بالکل آزادی کے ساتھ غور و فکر اور تحقیق و جستجو کا عمل جاری رکھتے ہوئے جس کی رائے بہتر نظر آئے اسے اختیار کرنا چاہیئے۔

میں یہاں یہ عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ میں دراصل تنظیم اسی نہج کی بنانا چاہتا ہوں جس میں آزادئ خیال پر کوئی قدغن اور کوئی جبر نہ ہو۔ اگر ایک شخص کو میرے پیش کئے ہوئے بنیادی اصولوں سے اس حد تک اتفاق ہو کر وہ میرے ہاتھ پر بیعت کر لے تو پھر وہ میرا ساتھی ہے۔ اس کے بعد میں اس کے کانوں پر اس کی آنکھوں پر کوئی مہر نہیں لگانا چاہتا۔ البتہ جیسا اسے مجھ سے اختلاف کا حق ہے ویسا ہی مجھے بھی ہے۔ اس کی ایک مثال سعید الرحمٰن علوی صاحب کا وہ مضمون ہے جو وہ گزشتہ چند ماہ سے میثاق میں لکھ رہے تھے۔ اس میں انہوں نے مولانا مودودیؒ کے بارے میں بھی بہت سی ایسی باتیں لکھیں جن سے مجھے اختلاف تھا۔ لیکن میں نے انھیں اس کا پورا موقع دیا۔ لیکن اب تازہ میثاق میں اسی موضوع پر میرا مضمون آ رہا ہے جس میں میں نے ان سے اختلاف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ میرے نزدیک مولانا مودودیؒ چودھویں صدی کی عظیم اسلامی شخصیتوں میں شامل ہیں۔ ان کا بڑا بلند مقام ہے۔ ذاتی طور پر میں تو ان کا بہت ہی ممنونِ احسان ہوں۔ یہ سب میں نے کھل کر لکھا ہے اور میثاق کے آئندہ شمارے میں انشاءاللہ آ جائے گا۔

میں نے اصل میں کانگریس میں تنظیم کا طریق کار دیکھا کہ اس میں کھلے اختلاف کی گنجائش ہے۔ یہاں تک کہ گروپ بھی بنے ہوئے ہیں۔ الگ الگ بلاک بنے ہوئے ہیں۔ مسائل پر کھلی گفتگو پر کہیں کوئی قدغن نہیں ہے۔ البتہ جب پارٹی کا ایک فیصلہ ہو جائے تو اس کے مطابق معاملات چلتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ غلبۂ اسلام کی تحریک میں بھی فکر و خیال کی یہی آزادی ہونی چاہیئے۔ اس میں صرف ایک مسئلہ قیادت کی بار بار تبدیلی کا پیدا ہوتا ہے کہ لوگ کبھی کسی کو لیڈر چن لیں گے اور کبھی کسی کو۔ اسی مسئلے کو حل کرنے کے لیے میں نے بیعت کا طریقہ اختیار کیا ہے۔ جس میں یہ مطالبہ کہیں نہیں ہے کہ آپ اندھے بہرے اور گونگے بن کر ہر معاملے میں اس کی تقلید کریں۔ صرف دعوت کے بنیادی اصولوں، طریق کار اور داعی کی شخصیت پر اعتماد ضروری ہے۔ اس کے بعد مسائل پر اظہارِ خیال کی کھلی آزادی ہے جس کے نتیجے میں مسائل کے مختلف رخ سامنے آئیں گے۔ ذہن بنیں گے۔ رفتہ رفتہ مختلف الیشوز پر اتفاق رائے کی شکل بھی نکلے گی اور اس طرح خوب سے خوب تر کی طرف سفر جاری رہے گا۔

س :- ڈاکٹر صاحب بیعت کا عمومی تصور کلی اتباع کا ہے، ایسی صورت میں یہ کس طرح ممکن ہے کہ ایک شخص آپ سے بیعت ہونے کے بعد علمی معاملات میں اختلاف کر سکے؟

ج :- بیعت کا تصور کلی اتباع کا قطعی نہیں ہے اس سلسلے میں بار بار میں جو حدیث بیان کرتا ہوں اس کا مفہوم یہ ہے کہ: "جہاں بھی ہوں گے حق بات کہیں گے، کسی ملامت کرنے والے کے ڈر سے اپنی زبانوں پر تالے نہیں ڈالیں گے"

کے مطابق ہی قائم رہنا ہوگا۔

میرے نزدیک درحقیقت اس نوع کی جماعت جس کا ذکر ہو رہا ہے، صرف بیعت ہی سے بن سکتی ہے۔ اگر ایسا نہ ہو بلکہ قیادت کے لئے انتخابی نظام رائج ہو تو پھر ووٹ فیصلہ کن حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ پھر نوبت یہاں تک ہوتی ہے کہ جن لوگوں کو ووٹ دینے کا اختیار ملتا ہے، انھیں یہ اختیار دیئے جانے سے پہلے مہینوں اور برسوں تک ایک خاص پروسس سے گزار کر ایک مخصوص طرز میں ڈھال دیا جائے، اور نظم کو اُس پر پورا اعتماد ہو جائے تب ان کے ہاتھ میں ایک ووٹ دینے کا خطرہ مول لیا جائے گا۔ اس طرح سے ایک خاص طرز کی جماعت وجود میں آتی ہے جس میں سارا زور ممبرشپ پر آ جاتا ہے۔ جبکہ بیعت کے اس نظام میں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ جو میرا ساتھ دیتا ہے حتیٰ کہ میرے لئے محض دعا ہی کرتا ہے وہ میرا ساتھی ہے۔ بیعت کرنے والا صرف ایک نظم کی پابندی کا معاہدہ کرتا ہے۔ ورنہ میرے کاز کا ہر خیر خواہ میرا ساتھی ہے۔ اس نظام میں قیادت کی تبدیلی کا کوئی سوال ہی نہیں ہے۔ بیعت کرنے والا یہ بھی لکھ کر دیتا ہے کہ آپ جسے امیر بنا دیں گے ہم اس کا حکم بھی اگر

ظاہری حالات بہت مایوس کن ہیں لیکن ہم ادائیگیٔ فرض کی خاطر اور اللہ کی قدرت و نصرت کے بھروسے پر کام کر رہے ہیں

شریعت کے دائرے میں ہوا تو اسی طرح مانیں گے جس طرح آپ کا مانتے ہیں۔ اس طریقے سے نہ تو اوپر کا اسٹرکچر ڈسٹرب ہونے کا کوئی اندیشہ ہوتا ہے، قیادت کا تسلسل برقرار رہتا ہے، انتخابی طریقے میں جو حفاظتی اقدامات کرنے پڑتے ہیں وہ یہاں خود بخود حاصل ہو جاتے ہیں، اور وابستگانِ تحریک میں کسی درجہ بندی کی ضرورت پیش نہیں آتی کہ فلاں کو ووٹ کا حق حاصل ہے اور فلاں کو نہیں ہے، کیونکہ اصل فیصلہ کن شخصیت یعنی داعیٔ تحریک اپنی جگہ قائم رہتا ہے۔ اس نظام

ہے اور اس میں کسی انتشار کا خدشہ نہیں ہوتا۔ یہ ماحول ایسی ہی جماعت میں ممکن ہے، دوسری جماعتوں میں ایک بند قسم کا نظام لازماً پیدا کرنا پڑتا ہے۔

س :- لیکن اس نظام میں ایک قباحت تو ہے اور وہ یہ کہ سارا نظام اُس شخص کی زندگی کے ساتھ تو چل سکتا ہے، اس کے بعد قیادت کا تسلسل اور وہ پورا اسٹرکچر جو اُس نے قائم کیا تھا کس طرح باقی رہ سکتا ہے؟

ج :- اس نظام میں قیادت کا تسلسل قائم رکھنے کی کئی شکلیں ہیں اور وہ سب کی سب ہمارے قرنِ اوّل میں ہمارے سامنے آ چکی ہیں۔ نظیریں قائم ہو چکی ہیں۔ اگر تحریک داعیٔ اوّل کی زندگی میں کامیاب ہو کر اسٹیٹ کے درجے تک پہنچ جائے، تب تو ریاست کا شورائی نظام اس امر کا فیصلہ کرے گا کہ قیادت کس طرح چلے اور سربراہِ مملکت کون ہو۔ اور یہ کام بہرحال الیکشن سے ہوگا۔ وہ جمہوری پروسس جو آج کا ہے اور جو تمدنی ارتقاء کے نتیجے میں آج اس مرحلے تک اسی طرح پہنچا ہے جیسے تلوار سے توپ تک ارتقاء ہوا ہے، اس مرحلے میں عمل میں آئے گا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس میں سے کوئی چیز حرام نہیں ہے سب مباح کے درجے میں ہے اور اسلام کے ساتھ اسے شامل کیا جا سکتا ہے۔

دوسری شکل یہ ہے کہ یہ کام کسی ایک جنریشن کے اندر نہ ہو جیسا کہ حالات بتاتے ہیں۔ تاریخ میں ایک ہی بار یہ کارنامہ نبی اکرمؐ کی قیادت میں ایک ہی نسل کے ہاتھوں انجام پایا ہے۔ اور بظاہر یہ بہت دشوار ہے کہ پھر کبھی ایسا ہو سکے۔ ایسی صورت میں تحریک کی قیادت کا تسلسل کس طرح برقرار رکھا جائے گا۔ اس کی مختلف شکلیں ہیں۔ اگر داعی کو اپنے ساتھیوں پر پورا اعتماد ہو کہ وہ صحیح آدمی کو منتخب کر لیں گے تو وہ فیصلہ ان ہی پر چھوڑ کر جا سکتا ہے جیسا خود حضورؐ اکرم نے کیا۔ دوسری شکل یہ ہے کہ اپنی زندگی ہی میں اپنے جانشین کو نامزد کرے جیسا حضرت ابوبکر صدیقؓ نے کیا اور تیسری شکل یہ ہے کہ معاملہ کسی کمیٹی کے حوالے کر جائے، جس کی مثال خلیفۂ دوم حضرت عمر فاروقؓ نے قائم کی۔

البتہ بیعتِ ریاست اور بیعتِ جماعت میں ایک فرق ہے اور وہ یہ کہ بیعتِ ریاست جب ہو جائے تو وہ ہر شخص کو ماننا پڑے گی کیونکہ اس کا دائرہ کار ٹیری ٹوریل ہوتا

ہے۔ اس لئے اس میں وہ لوگ جنھیں قائد کی شخصیت پر اعتماد نہ ہو، اپنی بیعت فسخ کر سکتے ہیں۔ یہ معاملہ جانشین ہی کے ساتھ نہیں ہے، داعی اوّل کے معاملے میں بھی یہ ہو سکتا ہے کہ ایک شخص کا خیال اس کے بارے میں بدل جائے، اس کے فہم و شعور پر اعتماد باقی نہ رہے، ایسی صورت میں بیعت جماعت فسخ کر دیتا قطعاً کوئی غلط حرکت نہیں ہے۔ اگر دل میں کسی کھوٹ کی وجہ سے ایسا کیا گیا تو اس کی جواب دہی اللہ کے ہاں ہوگی لیکن قانونی طور پر اس میں کوئی قباحت نہیں ہے۔

س :۔ آپ نے ابھی داعی اوّل کی اصطلاح استعمال کی ہے، کیا حضورؐ اکرم کے بعد امت مسلمہ کی کسی تحریک کے داعی کے لئے اس اصطلاح کا استعمال درست ہے؟ دوسرا سوال یہ ہے کہ اگر ریاست پر کوئی حملہ ہو اور سربراہ ریاست جہاد کا اعلان کرے لیکن داعی تحریک اسے جہاد قرار نہ دے تو ان لوگوں کو جو اس سے بیعت بھی ہیں اور ریاست کے شہری بھی ہیں کیا کرنا چاہیے؟

ج :۔ آپ کے پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ یہ سمجھنا درست نہیں ہے کہ داعی اوّل صرف حضورؐ ہیں اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ ہر چیز کی ایک میکینکس ہے اور تحریکوں کی میکینکس یہ ہے کہ ایک داعی کے بغیر کوئی تحریک شروع نہیں ہو سکتی اس لئے ہر دور میں جس شخص نے امت کے اندر کوئی تحریک برپا کی وہ اس تحریک کا داعی اوّل ہے۔ مثلاً سید احمد شہیدؒ اپنی تحریک کے داعی اوّل ہیں۔ مولانا مودودیؒ داعی اوّل تھے۔ اس تحریک کے، اگرچہ مجھے اس میں تھوڑا سا اختلاف ہے، میں اس دور کی اسلامی تحریک کا داعی اوّل مولانا ابوالکلام آزاد کو سمجھتا ہوں اور داعی ثانی مولانا مودودیؒ گو البتہ جماعت اسلامی کے داعی اوّل مولانا مودودیؒ ہی ہیں۔ جہاں تک حضور اکرمؐ کے مقام کا تعلق ہے تو آپ کی حیثیت داعی کی نہیں رسولؐ کی ہے۔

اب جہاں تک یہ بات ہے کہ داعی اوّل دوسرے لوگوں سے ممتاز کس بات میں ہوتا ہے تو ایسا نہیں کہ وہ یہ دعویٰ لے کر اٹھتا ہو کہ مجھ سے بڑھ کر متقی اور دیندار کوئی اور نہیں ہے۔ اصل میں جو چیز اسے دوسروں سے ممتاز کرتی ہے وہ دعوت کے مشن کو اپنی زندگی کا واحد نصب العین بنا لینا اور اسی کی خاطر جینا اور مرنا ہے۔ یہی

میں آتی ہے۔ دوسرے یہ کہ دعوت کے تقاضوں اور تحریک کو لے کر چلنے کے تقاضوں کو نبھانے کے معاملے میں وہ بحیثیت مجموعی دوسروں سے ممتاز ہوتا ہے۔ اپنی دعوت کی میکینکس کی باریکیوں کو وہی سب سے بہتر سمجھ سکتا ہے اور اسی وجہ سے اُسے یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ اپنی زندگی میں وہی اپنی تحریک کی قیادت کرتا رہے۔

جماعت اسلامی میں بھی قیادت کے معاملے میں مولانا مودودیؒ کی فکر بالکل یہی تھی۔ جو آج میں پیش کر رہا ہوں۔ میں یہ بات دعوے سے کہتا ہوں۔ انہوں نے ہمیشہ داعی کا تصور پیش کیا ہے پھر یہ کہ قیام جماعت سے چھ ماہ پہلے کا خط میں ریکارڈ پر لے آیا ہوں، جس میں مولانا نے خود بیعت کا تصور پیش کیا ہے۔ یہ مارچ ۱۹۴۱ء کا خط ہے، جو حیدر آباد کے محمد یونس صاحب کو لکھا گیا تھا، اس خط میں مولانا نے بیعت کی تین قسمیں بیان کی ہیں، جس میں سے ایک بیعت وہ ہے جو جماعت اسلامی کے امیر کے ہاتھ پر کی جاتی ہے۔ اس خط میں انہوں نے ایک حدیث کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ وہ بیعت ہے جس کے بارے میں حضورؐ نے فرمایا تھا کہ جو کوئی اس حال میں مرا کہ اس کی گردن میں بیعت کا قلادہ نہیں وہ جاہلیت کی موت مرا۔

اب سوال یہ ہے کہ تشکیل جماعت سے صرف

دور حاضر کی اسلامی تحریکوں نے مغرب

کی مرعوبیت کو ختم کرنے اور اسلام

پر مسلمانوں کا اعتماد بحال کرنے کا

کارنامہ انجام دیا ہے اب ایمان و

یقین کی کیفیت کو مستحکم کرنے

کے لیے کام کی ضرورت ہے۔

چھ ماہ پہلے مولانا نے جو بات کہی تھی، جماعت اس اصول پر کیوں نہیں بنائی۔ اس بارے میں میرا اندازہ یہ ہے کہ جماعت

احسن اصلاحی وغیرہ وہاں جمع ہوگئے تھے جن کے سامنے مولانا نے یہ بات کہنا مناسب نہیں سمجھا۔ اور اس کے بجائے یہ کہا کہ میرا کام آپ لوگوں کو جمع کر دینا تھا، اب آپ لوگ جسے مناسب سمجھیں اپنا امیر منتخب کرلیں۔ لیکن میرے خیال میں مولانا کا یہ فیصلہ درست نہیں تھا۔ کیونکہ جس نے جمع کیا لیکر چلنا بھی اسی کی ذمہ داری ہوتی ہے اس لئے انہیں کسی تکلف کے بغیر امارت سنبھالنی چاہیئے تھی کیونکہ فطری داعی وہی تھے، اور بعد کے حالات نے ثابت کر دیا کہ ان کی یہ حیثیت ہمیشہ برقرار رہی۔

اب رہا آپ کے سوال کا دوسرا حصہ کہ اگر ریاست جہاد کا اعلان کردے اور کسی دینی تحریک کی قیادت اس سے اتفاق نہ کرے تو اس کے وابستگان کو کیا کرنا چاہیئے۔ اس معاملے میں بات یہ ہے کہ آدمی کسی تحریک سے وابستہ ہو یا نہ ہو۔ بہر حال حکومت کے فیصلے سے اسے اختلاف ہر صورت میں ہو سکتا ہے۔ محمد علی باکسر نے ویت نام کی لڑائی میں شرکت نہ کرنے کا فیصلہ کیا اور پوری حکومت سے لڑائی مول لے لی۔ اس لئے انفرادی سطح پر یہ تنازع ہمیشہ ہو سکتا ہے۔ جماعت کی صورت میں یہ ہوگا کہ ہمیں دیکھنا ہوگا کہ ہم خود کس مرحلے میں ہیں، اور مسئلے کی نوعیت کیا ہے۔ اگر ہم PASSIVE RESISTANCE کے مرحلے سے بڑھ کر ACTIVE RESISTANCE میں داخل ہونے والے ہوں، تب تو اختلاف کی صورت میں ہمیں ایک ایشو ملے گا جس پر ہم دھڑلے سے میدان میں نکل کر حکومت کو چیلنج کر سکیں گے کہ اس کی بات درست نہیں ہے۔ لیکن اگر ہم ابھی اس مرحلے کے قریب نہیں پہنچے تو جس طرح دوسری منکرات برداشت کی جا رہی ہیں اسے بھی برداشت کرنا ہوگا۔ جس طرح ایک وقت تھا کہ حضورؐ کعبے کا طواف اس حالت میں کرتے تھے کہ اس میں بت رکھے ہوئے تھے۔ اس وقت بتوں کو توڑنے کا کام نہیں کیا گیا۔ لیکن فتح مکہ کے بعد ایک ایک بت توڑ کر کعبے کو پاک کر دیا گیا۔

س:۔ مسئلہ اصل میں یہ ہے کہ اگر ریاست پر کوئی بیرونی طاقت حملہ کرتی ہے، یا اندرون ملک کی کوئی طاقت حکومت کے خلاف بغاوت کر دیتی ہے اور اس کے خلاف جہاد کا اعلان ریاست کی طرف سے ہو جاتا ہے، اس صورت میں ایک ایسے فرد کے لئے جو آپ سے بیعت ہو یہ دشواری پیدا ہوتی ہے کہ وہ ایک طرف ریاست کا شہری ہونے کی وجہ سے اس کی اطاعت کا پابند ہے اور دوسری طرف آپ سے معاہدہ کر کے آپ کی اطاعت قبول کر چکا ہے۔ اب اگر ریاست اور آپ کے فیصلے میں اختلاف ہو تو اسے کیا کرنا چاہیئے؟

ج:۔ اس معاملے میں یہ بات بالکل واضح ہے کہ اگر ریاست پر کوئی بیرونی جارحیت ہو تو اس کا مقابلہ کرنا عین جہاد ہے، اس میں کوئی اختلاف ہی نہیں، وہ ہر حال میں ایک جائز جنگ ہے، اس میں جان دینا شہادت ہے، حدیث ہے کہ جو اپنے مال کی حفاظت میں مارا گیا وہ بھی شہید ہے۔ اب رہ گیا یہ مسئلہ کہ اگر ملک کے اندر سے کوئی گروہ کھڑا ہو جاتا ہے، جیسے سعودی عرب میں ہو چکا ہے، تو اس وقت کیا کیا جائے گا۔ ایسی صورت میں فیصلہ صورتحال کے مطابق ہوگا، اور امیر باہمی مشاورت سے کسی نتیجے پر پہنچے گا۔ اب اگر کسی فرد کو جماعت کے فیصلے سے اختلاف ہو تو اسے یہ دیکھنا ہوگا کہ کیا مسئلہ اتنا اہم ہے کہ اسے اپنی جماعت کی قیادت کے فیصلے کو تسلیم کرنے سے انکار کر دینا چاہیئے۔ اگر وہ یہ سمجھتا ہے تو اس کے لئے بیعت فسخ کرنے کا دروازہ کھلا پڑا ہے۔ اگر وہ معاملے کو اتنا اہم نہیں سمجھتا تو پھر اسے جماعت کی ہدایت کو قبول کر لینا چاہیئے۔

یہ صورتِ حال صرف اعلانِ جہاد ہی کی شکل میں پیدا نہیں ہوتی، کسی بھی مسئلے پر اختلاف کی شکل میں فرد اس دوراہے پر کھڑا ہوتا ہے۔ میرے نزدیک یہی مسئلہ حضرت حسینؓ کا تھا۔ ان کے نزدیک یزید کی جانشینی اتنی بڑی خرابی تھی کہ اسے چیلنج کرنا ضروری تھا۔ حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کے نزدیک یہ اتنی بڑی خرابی نہیں تھی۔ وہ اسے اس درجے کی خرابی نہیں سمجھتے تھے جسے چیلنج کرنا ضروری ہو۔

س:۔ انبیاء کسی غیر اسلامی معاشرے سے، کسی کافرانہ معاشرے سے یا بگڑے ہوئے مسلمانوں کے معاشرے سے بھی جہاں ان کو مبعوث کیا گیا ہو، اپنی دعوتی جدوجہد پر معاشرے سے کسی اجر کے طالب نہیں ہوتے تھے اور کہتے تھے کہ وَمَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا، إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَى اللّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ۔ یہ بات ان کی بے لوثی کی دلیل ہوتی تھی اور لوگوں کی جانب سے ان پر مفاد طلبی کا کوئی الزام لگانا ممکن نہ ہوتا تھا۔ لیکن ہمارے زمانے میں جو دینی جماعتیں اپنے دعوتی کام کے ساتھ ساتھ لوگوں سے کسی نہ

کسی صورت میں حصے کی طالب ہوتی ہیں، ووٹ کی شکل میں، اقتدار کی شکل میں، کیا اس عمل سے لوگوں کی نظر میں ان کی بے لوثی مشتبہ نہیں ہو جاتی، اور قطعی بے غرضی کے ساتھ کام کے نتیجے میں انہیں معاشرے کا جو اعتماد حاصل ہو سکتا ہے کیا وہ اس سے محروم نہیں ہو جاتیں؟

ج:۔ میں سمجھتا ہوں کہ انتخابی عمل میں یہ قباحت موجود ہے، دیکھنے والوں کو یہ محسوس ہو سکتا ہے کہ یہ ورکرز کی بھیک مانگنے آیا ہے، تو یہ چیزیں بے لوثی کو مشتبہ تو ضرور بنا دیتی ہیں جبکہ انقلابی عمل میں ایسی کوئی مشکل نہیں ہوتی۔

س:۔ لیکن اگر سارے بھلے لوگ اسی بے لوثی کے مغالطے کی خاطر انتخابی سیاست سے جو ہر حال جاری ہے الگ تھلگ ہو کر بیٹھ جائیں تو کیا غلط کار لوگوں کو کھل کھیلنے کے لیے کھلا میدان نہیں مل جائے گا؟ آپ کی جانب سے انتخابی سیاست کی ضرورت کے اظہار کے باوجود جو لاتعلقی کی پالیسی اختیار کر رکھی گئی ہے، اگر دوسری دینی جماعتیں بھی یہی طریقہ اختیار کر لیں تو کیا نتیجہ یہی نہیں ہوگا کہ لادینی قوتیں بلا شرکت غیرے تمام اختیارات کی مالک بن جائیں گی؟

ج:۔ غلط کار لوگوں کی معاونت ہماری جانب سے اسی صورت میں سمجھی جا سکتی ہے جب ہم انتخابی عمل پر کسی بھی صورت میں اثر انداز نہ ہو رہے ہوں۔ لیکن دو چیزیں ہیں جو اس سوال کی زد سے ہمیں الگ کر دیتی ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ ہم PASSIVE لوگ نہیں ہیں، اہم اسلام کے لیے فعال انداز میں سرگرم عمل ہیں، سیاست کے میدان میں باطل اسلامی قوتیں ہیں ہم انہیں بالواسطہ تقویت پہنچا رہے ہیں، اور غیر اسلامی قوتوں کے خلاف زمین ہموار کر رہے ہیں۔ دوسرے یہ کہ ایک بات ہے خود جا کر ووٹ مانگنا، ہم نے صرف اس کی نفی کی ہے، ووٹ دینے کی نفی نہیں کی ہے۔ ووٹ نہ صرف ہم خود دیں گے بلکہ لوگوں سے بھی کہیں گے کہ بھائی دو شرطیں اپنے سامنے رکھو۔ ایک تو یہ کہ جسے ووٹ دو پہلے دیکھ کر اور امکانی حد تک چھان پھٹک کر دو کہ وہ اسلام کا پابند ہو، نماز پڑھتا ہو، شرابی نہ ہو، کھرے کردار کا مالک ہو، اور دوسرے یہ کہ کسی ایسی پارٹی سے وابستہ نہ ہو جس کے منشور میں کوئی نکتہ اسلام کے خلاف ہو۔ اس اعتبار سے آپ کا اعتراض ہم پر وارد نہیں ہوتا۔

س:۔ آپ کے خیال میں اسلامی تحریک کے لیے آئیڈیل صورت، انقلابی عمل کی ہے۔ اب اگر ساری دینی جماعتیں انتخابی طریقے کو چھوڑ کر آپ کا طریقہ اختیار کر لیں تو پھر آخر انتخابات میں وہ امیدوار کہاں سے آئیں گے جنہیں اسلامی ذہن رکھنے والا ایک ووٹر ووٹ دے سکے؟

ج:۔ اگر ساری دینی جماعتیں ہماری دعوت سے اتنی متاثر ہو جائیں کہ اپنا طریق کار ترک کر کے ہمارا طریقہ اختیار کر لیں تب تو کام بہت ہی آسان ہو جائے گا، برسوں کی مسافت دنوں میں طے ہو جائے گی اور اسلامی انقلاب برپا ہو جائے گا، لیکن بظاہر یہ بہت بعید از امکان بات ہے جو کچھ متوقع ہے وہ یہی ہے کہ دونوں طرح کی جماعتیں اپنے اپنے طور پر دین کا کام کرتی رہیں گی اور ہماری جانب سے انتخابی طریقے پر کاربند دینی جماعتوں سے بالواسطہ تعاون کا سلسلہ برقرار رہے گا۔

س:۔ آپ نے اپنے طریق کار میں ہجرت اور جہاد کی اصطلاحات بھی استعمال کی ہیں۔ جہاد کی انتہائی شکل قتال ہے۔ کیا ACTIVE RESISTANCE کے مرحلے میں اس بات کا امکان ہے کہ نوبت قتال تک جا پہنچے، کیا مسلمانوں کے درمیان قتال شروع کرنا یا اس کے اسباب فراہم کرنا جائز ہے؟

ج:۔ غلبۂ دین کی اس جدید جہد میں اگرچہ قتال

خواتین اور ڈاکٹر اسرار احمد

س:۔ عام تاثر ہے کہ خواتین آپ سے بہت برہم ہیں، اس کا کیا سبب ہے۔؟

ج:۔ میرے نزدیک یہ بہت بڑا مغالطہ ہے، میری ہم خیال خواتین کی تعداد مجھ سے اختلاف رکھنے والی بیگمات سے کہیں زیادہ ہے لیکن چونکہ ذرائع ابلاغ انہیں پروجیکٹ کرتے ہیں، ان کی خبریں حاشیوں اور سرخی پوڈر کے ساتھ شائع ہوتی ہیں اس لیے تاثر یہی بنتا ہے کہ خواتین میں میری مخالفت بہت زیادہ ہے۔

شخصیت پرستی کا روگ مسلمانوں میں فرقہ بندی کا ایک اہم سبب ہے

ہمارے پروگرام میں شامل نہیں ہے، لیکن شرعاً یہ حرام مطلق بھی نہیں ہے، البتہ اس کی شرائط بہت سخت ہیں۔ ہمارے پروگرام میں جو کچھ شامل ہے وہ منکرات کے خلاف پُرامن احتجاج کی مختلف شکلیں ہیں، جس کے نتیجے میں ہم پر تشدد متوقع ہے لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ یہ تشدد ایک حد سے آگے نہیں بڑھ سکتا جس کے بعد انشاء اللہ حالات میں تبدیلی رونما ہوگی اور اسلامی انقلاب برپا ہو جائے گا۔

س :- آپ کے خیال میں مسلم معاشرے میں بگاڑ کی وہ کون سی بنیادی صورتیں ہیں جو اسلامی انقلاب کی راہ میں حائل ہیں؟

ج :- سب سے بڑی رکاوٹ ہے یقین و ایمان کا اضمحلال، اس ایمان کو زندہ کرنے کا ذریعہ قرآن ہے اور میں ۲۰ برس سے اسی جدوجہد میں مصروف ہوں کہ لوگوں میں قرآن سے لگاؤ اور قرآنی شعور پیدا ہو۔

س :- آپ کی اس جدوجہد کے نتائج کیا رہے ہیں، اور انہیں آپ کس حد تک حوصلہ افزا سمجھتے ہیں؟

ج :- بہت کم حوصلہ افزا، ظاہری نتائج کی بنیاد پر کوئی فیصلہ کرتا ہو تو میں کہوں گا کہ صورت حال مایوس کن رہی ہے اور اس کی بناء پر مجھے ہاتھ پاؤں سمیٹ کر بیٹھ جانا چاہیئے، لیکن میری جدوجہد کا مقصد تو اپنی ذمہ داری ادا کرنا ہے نتیجہ اللہ کے ہاتھ میں ہے تنظیم کے بارے میں بھی میں یہ نہیں کہتا کہ میں نے کوئی تنظیم قائم کر لی ہے، صرف یہ کہتا ہوں کہ اس بات کی کوشش کر رہا ہوں۔

س :- اب تک آپ کے وابستگان کی تعداد کتنی ہے؟

ج :- تقریباً ڈیڑھ ہزار حضرات ہیں جنہوں نے مجھ سے بیعت کی ہے۔ لیکن ان میں جنہیں میں واقعتاً پوری طرح سنجیدہ سمجھتا ہوں وہ پانچ سو سے زائد نہیں۔

س :- آپ کے نزدیک غیر مسلم قوتوں خصوصاً بڑی طاقتوں نے اسلامی انقلاب کی راہ روکنے کے لیے کیا تدابیر اختیار کی ہیں، گزشتہ نصف صدی سے مسلم دنیا کے مختلف خطوں میں اسلامی انقلاب کی جدوجہد جاری ہے مگر کامیابی اب تک نہیں ہوئی، اس کے اہم خارجی اسباب کیا ہیں؟

ج :- میرے نزدیک اصل اہمیت خارجی اسباب کی ہے ہی نہیں۔ اصل مسئلہ داخلی ہے، اپنے ایمان اور کمٹ منٹ کی کمزوری ہے۔ یہ اضمحلال صدیوں کا ہے۔ اس کیفیت کو بدلنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ اس میں وقت لگے گا۔ دوسرے یہ کہ اگر آج کی دنیا میں کسی ایک ملک میں بھی اگر واقعتاً اسلامی انقلاب جڑیں جما چکا ہو تو اسے نہ روس روک سکتا ہے نہ امریکہ بلکہ ان دونوں کے درمیان طاقت کا جو توازن ہے وہ کسی خطے میں پروان چڑھتے ہوئے اسلامی انقلاب کے لیے تحفظ کا ذریعہ بن سکتا ہے۔ اب اندرونی رکاوٹوں میں ایمان و یقین کی کمزوری کے علاوہ دوسری

> مکمل اسلامی نظام کے قیام کے بجائے محض جزوی اصلاح کی کوششیں اسلام کو بدنام کرنے کا ذریعہ تو بن سکتی ہیں مگر دین کی کوئی مفید خدمت اس طرح انجام نہیں دی جا سکتی۔

چیز تفرقہ ہے۔ کسی بھی انقلابی تحریک کے لیے ضروری ہے کہ بڑے صبر و تحمل کے ساتھ علماء کی حمایت اور اعتماد حاصل کرنے کا کام کرے۔ یہ دشوار کام ہے، وقت لگے گا۔ لیکن ایک روز آئے گا کہ ان میں سے اچھی

خاصی تعداد اس کام کے لیے نکلے گی۔ تیسری بات یہ کہ ہمارا زوال اتنا طویل اور اتنا گہرا تھا کہ ابھرنے کا عمل بھی وقت لے گا۔ در جہ بدرجہ آگے بڑھے گا اور ہو سکتا ہے کئی نسلوں کے بعد مکمل کامیابی کی منزل آئے۔ جن میں سے دو یا تین نسلیں گزر چکی ہیں۔ اس احیائی عمل کا پہلا مرحلہ مغربی استعمار کی براہِ راست غلامی سے نجات کا تھا۔ پوری تیسری دنیا اس دور میں غلامی سے آزاد ہوئی۔ اس عمل میں اسلام کہیں بھی قوت متحرکہ نہیں تھا۔ پاکستان میں صرف اسلام کا نام لیا گیا اور کسی مسلم ملک میں نام بھی نہیں لیا گیا۔ اس کے باوجود میرے نزدیک احیائے اسلام کا یہ بھی ایک مرحلہ ہے۔

دوسرا مرحلہ دینی تحریکوں کا تھا۔ جن میں سے اخوان المسلمون اور جماعت اسلامی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ برصغیر میں اسلامی تحریک کے پہلے داعی میرے خیال میں مولانا ابوالکلام آزاد ہیں لیکن وہ بہت جلد علماء کے رویے سے بددل ہو کر دوسرے راستے پر نکل گئے۔ ان کے بعد مولانا مودودیؒ نے اس کام کو سنبھالا۔ انہوں نے اپنی محنت، لگن اور جدوجہد سے بہرحال ایک عمارت کھڑی کی اور علماء کی مخالفتوں کے باوجود یہ کام کر کے دکھا دیا۔ لیکن پاکستان بننے کے بعد میرے خیال میں ان کی ایک غلطی کی وجہ سے ان کی تحریک کو نقصان پہنچ گیا۔ اگرچہ تحریک چل رہی ہے اور میں اپنے آپ کو اسی تحریک کا ایک جزو سمجھتا ہوں۔ بہرحال دینی تحریکوں کے اس مرحلے میں اسلامی طاقتوں نے بہت کچھ حاصل کیا ہے۔ مغرب کی مرعوبیت ختم ہوئی ہے۔ نوجوانوں میں اسلام پر اعتماد، اس سے لگاؤ اور دینی شعور پیدا ہوا ہے اور بحیثیت مجموعی پوری امت میں خود اعتمادی ان تحریکوں کے ذریعے پیدا ہوئی ہے۔ اسلام ایک نظامِ زندگی کی حیثیت سے ابھر کر سامنے آیا ہے۔ لیکن ان تحریکوں کے ذریعے وہ اصل کام جو ایمان کی جڑوں کو مضبوط کرنے کا تھا وہ نہیں ہو پایا ہے۔ اب اگر تیسرے مرحلے میں یہ کام ہو جائے تو یہ سب چیزیں مل کر ان شاء اللہ ایک بہت بڑا نتیجہ پیدا کریں گی۔

بشکریہ ہفت روزہ تکبیر کراچی

ڈاکٹر صاحب جماعتِ اسلامی کی مرکزی مجلسِ شوریٰ کے کبھی رکن نہیں رہے
اس معاملہ میں تسامح ہوا ہے البتہ ۵۵ء کے سالانہ اجتماع کے موقع پر
دستورِ جماعتِ اسلامی کی تدوینِ نو کیلئے جو مجلسِ دستور ساز منتخب ہوئی تھی
اس کے وہ رکن منتخب ہوئے تھے۔

(ادارہ میثاق)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ

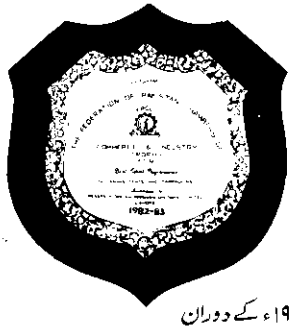

ایک اور اعزاز

اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے گزشتہ سالوں کی طرح ۸۳-۱۹۸۲ء کے دوران
بھی ہماری بہترین برآمدی کارکردگی اور وطن عزیز کے لیے کثیر زرمبادلہ کمانے پر فیڈریشن آف
پاکستان چیمبرز آف کامرس اینڈ انڈسٹری کی جانب سے ہم ایک بار پھر

بہترین برآمدی کارکردگی کی ٹرافی

کے مستحق قرار پائے

یہ ٹرافی جناب جنرل محمد ضیاء الحق صاحب صدر پاکستان نے ایک پُروقار تقریب میں اپنے ہاتھوں سے ہمیں عطا فرمائی۔

ٹین خیمے۔ ترپالیں اور کینوس کی دیگر مصنوعات کے سب
سے بڑے برآمد کنندگان ہونے کا بجا طور پر شرف حاصل ہے۔

حاجی شیخ نورالدین اینڈ سنز لمیٹڈ

SNDS

پاکستان میں کینوس مصنوعات کے سب سے بڑے برآمد کنندگان

ہیڈ آفس: حفیظ چیمبرز، ۸۵۰۔ شاہراہ قائداعظم، لاہور ۱ (پاکستان)
فون: ۳۰۶۴۶۸ - ۳۰۵۴۶۹ تار: شاہی خیمہ ٹیلیکس: 44543 NOOR PK
ایکسپورٹ آفس: ۶۱۶-۶۱۴ کامرس سینٹر، چھٹی منزل، حسرت موہانی روڈ۔ کراچی ۱ (پاکستان)
فون: ۲۱۳۵۴۰ - ۲۱۴۳۸۷ تار: 'TARPAULIN' ٹیلیکس: 25480 NOOR PK

Regd. L. No. 7360

MONTHLY **"MEESAQ"** LAHORE

Vol. 35	MARCH 1986	No. 3

Siddiq Sons Industries Ltd.

Largest Manufacturers & Exporters of :

WATERPROOF COTTON CANVAS, TARPAULINS, TENTS, WEBBING AND OTHER CANVAS PRODUCTS,

HEAD OFFICE :

5-C, 5th FLOOR, SIDCO EVENUE CENTRE
264-R. A. LINES, KARACHI (PAKISTAN)

2 - K GULBERG II, SHAHRAH-E-IQBAL, LAHORE.
TELEFHONE : 870512 880721